

# فرد آشنا

شگفته شاه



## درد آشنا

”ڈاکٹر صاحب یقین مانئے۔۔۔ میں پاگل ہوں۔۔۔ سائیکو ہوں۔۔۔ مجھے یہاں ایڈمٹ کریں۔!“

اچانک کھلے دروازے سے وہ اندر آئی اور انچارج ڈاکٹر کے سامنے کھڑی ہو کر چیخ چیخ کر کہنے لگی تو وہاں بیٹھی ایک خاتون اسے دیکھ کر چونک پڑی۔۔۔ وہ خوبصورت پڑھی لکھی اور خوش لباس تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ بار بار ڈاکٹر کو یہی کہہ رہی تھی کہ وہ پاگل اور سائیکو ہے۔ اسے ایڈمٹ کیا جائے۔ خاتون نے اسے پہچان لیا تھا۔۔۔ یہ اس کی یونیورسٹی فیلو تھی اور نامور ادیبہ تھی۔ اچانک اس کی نظر ایک کونے میں کھڑے شخص پر پڑی جو اپنے موبائل سے اس منظر کی ویڈیو بھر رہا تھا۔ وہ خود ملک کی ایک نامور سماجی ورکر تھی۔ اپنے فلاحی کاموں کے ایک پراجیکٹ کے سلسلے میں ہی آج وہ یہاں آئی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پی۔ اے سے کچھ آہستہ سے کہا اور اس نے اٹھ کر جھپٹ کر اس شخص کے ہاتھوں سے موبائل چھین لیا۔

”نکل جاؤ تم یہاں سے۔۔۔“ انچارج ڈاکٹر نے بھی دھاڑ کر کہا تو وہ شخص خوفزدہ ہو کر آفس سے نکل گیا۔ انچارج نے اسے تھوڑی دیر پہلے بلایا تھا۔ وہ وہاں کا کلرک تھا۔

”بی بی۔۔۔ پلیز۔۔۔!۔۔۔ آپ ریلیکس ہو کر بیٹھ جائیں یہاں۔۔۔“ ڈاکٹر نے اٹھ کر اس کے قریب

آتے ہوئے کہا۔ سوشل ورکر خاتون نے بڑھ کر اسے شانوں سے پکڑ کر صوفے پر بیٹھایا وہ اب بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

”جلدی سے یہ انجکشن لے آؤ۔“ ڈاکٹر نے وہاں کے ایک ملازم سے کہا تو وہ دوڑا گیا۔

”سرجی کسی نیوز چینل کا نمائندہ گیٹ پر آیا ہے اندر آنا چاہتا تھا۔۔۔ ہم نے روک لیا ہے۔“

”اچھا کیا۔۔۔ کسی نے اندر سے اطلاع کر کے بلایا ہوگا۔۔۔“

وہ زور زور سے رو رہی تھی۔۔۔ چیخ رہی تھی اتنے میں ایک نرس انجکشن لئے دوڑی آئی اور ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق اسے انجکشن دیا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں اسے جانتی ہوں۔۔۔ میری یونیورسٹی فیلو تھی میں اسے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں ورنہ خبر میڈیا کے ہاتھ لگ گئی تو ان لوگوں کو صرف خبر لگانے سے غرض ہوتی ہے۔۔۔ کسی کی عزت و آبرو سے نہیں اس کا چیک اپ کرنے کے لیے آپ کسی کو بھیج دیجئے گا میرے گھر پلیز۔۔۔“

انجکشن کے زیر اثر اب وہ سو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

ام کے گلابی اور سرمئی رنگ آسمان پر بکھرے ہوئے تھے۔ گرمیوں کی اس خوشگوار شام میں ٹھنڈی ہوا پودوں اور پتوں سے اٹھکلیاں کر رہی تھی۔ دور سے کہیں کوئل کی کوک سنا کی دے رہی تھی اور چڑیوں کی چہچہاہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔۔۔ فطرت کے یہ تمام رنگ ہر انسان کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے مگر۔۔۔ کسی دور کی۔۔۔ فطرت کے شیدائی اور فطرت کے ان رنگوں کو کیوس پر پینٹ کرنے والی، اپنے دور کی مشہور اور مقبول آرٹسٹ رائیل۔۔۔ جو اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑی، اداس چہرہ لئے ویران آنکھوں سے لان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں اب وہ پہلے والی امنگوں اور جذباتوں سے بھرپور لڑکی کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا۔ وہ تو مغرب کے بعد اپنے کمرے میں پھیلنے والے اندھیرے سے بھی بے خبر کھڑی تھی کہ اچانک سے اس کے موبائل فون کی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا اور کمرے کی لائٹ آن کر کے اس نے انجانے نمبر سے آتی ہوئی کال کو ریسیو کیا تو دوسری طرف سے ایک خوبصورت مردانہ آواز سنائی دی۔

”آپ رائیل صاحبہ بات کر رہی ہیں۔۔۔؟“

”جی ہاں۔۔۔ آپ کون صاحب بات کر رہے ہیں۔۔۔؟“

اس نے حیران ہو کر پوچھا کیونکہ اس کا نمبر محدود لوگوں کے پاس تھا۔

”السلام علیکم! میرا نام فیضان احمد ہے میں نے ”مشعل“ کے نام سے ایک ادبی، ثقافتی اور سماجی خدمت کا فورم قائم کیا ہے۔ جس کا مقصد ایک طرف تو ایک ایسا سلسلہ شروع کرنا ہے جس سے ہم اپنی نوجوان نسل کو اپنی زبان، ادب، کلچر اور سماجی مسائل سے آگاہ کریں اور اسی سلسلے کے پروگرام بھی اربح کرنا ہے تاکہ وہ عملی طور میں بھی ان میں شرکت کریں۔ اسی سلسلے میں، میں نے کافی دوستوں، ادیبوں اور سماجی ورکرز سے بھی رابطہ کیا ہے اور مجھے آپ کے تعاون کی بھی ضرورت ہے۔“

اس نے ایک سانس میں ہی سب کہہ دیا۔

”مگر۔۔۔ میں نہ تو ادیبہ ہوں اور نہ ہی کوئی سوشل ورکر۔ میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔۔۔؟“ رائیل نے کہا۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں نے عرض کیا نہ کہ یہ ایک ثقافتی تنظیم یا فورم بھی ہے اور جیسا کہ آپ یونیورسٹی کے آرٹ کے شعبے میں اسٹنٹ پروفیسر ہیں اور نامور فنکارہ ہیں۔۔۔ تو دراصل میں ایک ایسا معیاری جریدہ بھی نکالنا چاہتا ہوں جس میں ادب کے علاوہ آرٹ پر مضامین، نمائشوں کی رپورٹیں اور آرٹسٹوں کے انٹرویو وغیرہ بھی شامل ہوں گے اس کے علاوہ ہمارے علاقائی فنون اور ہتھروں سے متعلق سرگرمیاں اور ایسی دوسری چیزیں بھی ہوں گی۔“

یہ بات سن کر ایک بار رائیل کے وجود کے اندر جیسے زندگی کی ایک لہر ابھری۔

”آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔ آپ کو یہ خیال کیسے آیا۔؟“ وہ پوچھ بیٹھی۔

”رائیل صاحبہ! آپ نے ادب کے حوالے سے شاید میرا نام سنا ہو۔ میں بنیادی طور پر اسٹوری رائٹر ہوں مگر میں نے سفر نامے بھی لکھے ہیں کیونکہ میں نے اپنی عمر کا بہت سا وقت سیر و سفر میں گزارا ہے۔ اب بھی میں تقریباً پانچ سال کے بعد امریکہ سے لوٹا ہوں۔“



باہر کی دنیا میں آرٹ کو بہت اہمیت دی جاتی ہے مگر بد قسمتی سے ہمارے پاس فن اور فنکاروں کی قدر نہیں۔ سو بس سوچا کہ کوئی ایسا پلیٹ فارم بنایا جائے جس کے ذریعے ہمارے آرٹ اور علم و ادب کو عام آدمی تک، خصوصاً نوجوان نسل تک پہنچایا جائے۔ تاکہ وہ اس کو پہچانیں۔۔۔ ہمارے بڑے ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں کو۔۔۔ کیونکہ یہ دور ٹیکنالوجی اور نیٹ کا ہے جہاں ایک طرف تو ہم دنیا میں کہیں بھی رونما ہونے والے اہم واقعے سے باخبر ہو جاتے ہیں مگر بد نصیبی سے ہم اپنی زبان، ثقافت اور اقدار سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہمارے نوجوان دوسرے ملکوں کے اداکاروں، کھلاڑیوں اور اہم شخصیات سے تو واقف ہیں مگر اپنے عالموں، بڑے شاعروں اور ادیبوں سے واقف نہیں۔۔۔ اوہ۔۔۔

سوری۔۔۔؟ آپ پور تو نہیں ہو رہے ہیں۔۔۔؟ میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گیا۔۔۔؟

رائیل کے اندر سے زندگی کی رتق پھر غائب ہو گئی اور یاسیت پسند رائیل پھر جاگ پڑی۔ اس نے بیزار سے کہا۔

”مگر۔۔۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔۔۔؟“

”دراصل۔۔۔ یونیورسٹی کی فائن آرٹس کے شعبے میں ویسے تو بہت استاد ہیں مگر آرٹ میں ان کا کوئی خاص کنٹریبوشن نہیں ہے۔۔۔ جب کہ آپ کا اس سلسلے میں بہت نام ہے اور آپ کی تصویروں کی کئی نمائشیں ہو چکی ہیں۔ آپ کی ایک منفرد پہچان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے آپ سے بہت مدد مل پائے گی۔ آپ پلیز تھوڑا سا وقت نکال کر میرے آفس میں آئیں تاکہ اس سلسلے میں بات چیت ہو سکے۔۔۔“

رائیل کا جی چاہا کہ فوراً اسے منع کر دے مگر پتہ نہیں کیوں وہ سختی سے جواب نہ دے سکی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔

”فیضان صاحب! میں اب سوشل نہیں رہی۔ میری پینٹنگز کی آخری نمائش ہوئے بہت عرصہ گزرا ہے نہ ہی کئی سالوں سے میں نے کوئی نئی تصویر بنائی ہے۔ میں تو عرصے سے کسی گیلری میں آرٹ کی نمائش بھی دیکھنے نہیں گئی۔ میں تو بس یونیورسٹی اور گھر تک محدود ہوں میں شاید آپ کی۔۔۔۔۔“

”پلیز!۔۔۔ پلیز!۔۔۔ رائیل صاحبہ! میں صرف تھوڑا سا وقت لوں گا آپ کا وقت نکال کر کل تھوڑی دیر

کے لئے آجائیں۔۔۔ پلیز!“

وہ اس کی بات کاٹ کر عاجزانہ لہجے میں بولا تو وہ حیران و پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ یہ کس قسم کا انسان ہے؟ اس پر تو میری بے رخی کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔ اس نے محض جان چھڑانے کی خاطر کہا۔۔۔

”دیکھیں! میں وعدہ نہیں کرتی البتہ کوشش کروں گی۔“

”اوہ! تھینک یو! میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔“

وہ اسے آفس کا ایڈریس سمجھانے لگا بات پوری ہونے پر کاس ڈسکلیٹ کر کے وہ سوچنے لگی۔۔۔

”عجیب آدمی ہے یہ۔۔۔!“

☆.....☆.....☆

سوشل ورکر خاتون اسے اپنے گھر لے کر آ گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ایک ڈاکٹر آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ محض شدید ڈپریشن کی حالت تھی۔۔۔ اس کا دماغی توازن درست تھا۔ اس نے دوائیاں لکھ کر دیں۔

پھر وہ اپنے کمرے میں آئی۔ پرس سے وہ موبائل نکالا جس میں دینی مریضوں کے ہسپتال کے کلرک نے اس واقعے کی ویڈیو بنائی تھی۔ اس نے ویڈیو دیکھی جس میں وہ پاگلوں کی طرح چیخ کر ڈاکٹر کو اسے ایڈمٹ کرنے کا کہہ رہی تھی۔

”اف!۔۔۔ یہ ذلیل لوگ۔۔۔ اگر وہ موبائل نہ لیتی تو یہ ویڈیو سوشل میڈیا یا ٹی وی چینل پر دی جا چکی ہوتی۔۔۔“

اس نے ویڈیو کو اپنے موبائل سیٹ میں شفٹ کیا اور کلرک کے فون سے ڈیلیٹ کر دی۔ پھر اپنے پی اے کو بلوا کر کہا۔

”میں نے ویڈیو ڈیلیٹ کر دی ہے پھر بھی اچھی طرح چیک کرو اور پھر یہ موبائل واپس کر دو جس کا ہے۔ معلوم کرو کہ جوٹی وی کا نمائندہ وہاں آیا تھا وہ کس چینل کا تھا۔ کوئی نیوز چلنے نہ پائے۔“

”اوکے میم!“ اس نے مودبانہ کہا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن یونیورسٹی سے گھر آنے کے بعد رائیل کے ذہن پر فیضان سے کہے ہوئے وعدے کا بوجھ سا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر آنے کا کہہ بیٹھی تھی پھر کھانے کے بعد وہ سکون کی دوا کا ڈوز لے کر ایسی سوئی کہ اس وقت آنکھ کھلی جب کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیل رہا تھا اور ملازمہ گلاں اس کے لئے چائے لے کر آئی تھی۔ وہ ابھی ہاتھ منہ دھو کر فریش اپ ہو کر لائٹ آن کر کے بیٹھی ہی تھی کہ موبائل کی رنگ ٹون نے اسے چوٹکا دیا تھا۔ فیضان کا نمبر تھا۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔۔

”رائیل صاحبہ ! فیضان بات کر رہا ہوں۔۔“

”جی۔۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”میں نے آج سارا دن آپ کا انتظار کیا مگر آپ نہیں آئیں۔۔“

اب رائیل کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ وہ گڑبڑا کر بولی۔

”جی۔۔۔ دراصل کچھ مصروفیت ایسی رہی کہ آ نہیں سکی۔۔۔“

”میں عام طور پر سات ساڑھے سات تک آفس میں بیٹھتا ہوں۔ اب بھی آسکیں تو تھوڑی دیر کے لئے آ جائیں پلیز۔۔!“

”جی۔۔۔ وہ۔۔۔ میں کوشش کرتی ہوں۔۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔ اسے خود پر بے تحاشہ غصہ آ رہا تھا کہ وہ تو بہت اسٹریٹ فارورڈ تھی۔ اسے فوراً منع کر دینا چاہئے تھا۔۔۔ مگر اس اجنبی شخص کی آواز اور لہجے میں کچھ ایسا سحر تھا اور اس قدر اپنا پن تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے سخت لہجے میں بات نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کبھی کانٹکے کا جواب دے چکی ہوتی اسے۔۔۔

وہ اپنا دھیان بٹانے کے لئے چائے پی کر کمرے سے باہر آئی۔ ملازمہ گلاں کچن میں رات کے کھانے کی تیاری میں تھی اس کی پھپھو اسے ہدایات دے رہی تھیں۔ گلاں بابا بیرو کی بیوہ بیٹی تھی جواب اپنے بارہ سالہ بیٹے سمیت ان کے گھر میں رہتی تھی۔ بابا بیرو باہر کا اور باغ کی رکھوالی کا کام کرتا تھا۔ جس میں اس کا نواسا شفیع عرف ”شفن“ بھی اسکول کے بعد آ کر مدد کرتا۔ گلاں گھر کا کام کاج کرتی۔ پھپھو اسے دیکھ کر براہِ مدے میں چلی آئیں

اور کرسی کھسکا کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گئیں اور حسب عادت اڑوس پڑوس کے احوال بتا رہی تھیں۔ وہ بے دھیانی سے ان کی باتیں سن کر فقط ”ہوں۔۔۔ ہاں“ کہہ رہی تھی۔ یوں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا کہ اسے اپنے موبائل کی رنگ ٹون کمرے سے سنائی دی جسے وہ وہیں چھوڑ آئی تھی۔ اس نے کال اینڈ کی تو فیضان کی تھکی تھکی سی آواز سنائی دی۔۔۔

”آپ آئیں نہیں۔۔۔؟!۔۔۔ میں نے بہت انتظار کیا آپ کا۔۔۔“

”اوہ۔۔۔ فیضان صاحب! آپ میرے لئے اتنی دیر تک آفس میں بیٹھے رہے۔۔۔؟ اس نے حیران ہو کر پوچھا تو فیضان احمد نے دھکی لہجے میں کہا۔

”آپ نے شاید مجھے ان مردوں میں سے سمجھا ہے جو اس طرح سے خواتین سے فری ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لئے شاید آپ مجھے اگور کر رہی ہیں۔ میں نے لوگوں سے آپ کے منفی اور رڈ رو روپے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کے لئے بہت عزت اور احترام ہے۔ مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

رائیل اب سچ مچ شرمندگی محسوس کرنے لگی کہ وہ انتظار کرتا رہا اور اس نے ان کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس نے کہا۔۔۔

”فیضان صاحب! واقعی میں نے آپ کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔۔۔ مگر اب ٹائم ضرور نکالوں گی اور کل ضرور آؤں گی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔۔۔“

”جھینکس! میں مشکور ہوں گا۔۔۔“

☆.....☆.....☆

”سوشل ورکر خاتون ہر طرح سے اس کا خیال رکھ رہی تھی۔ اس کے ہینڈ بیگ سے اس کے آئی ڈی کارڈ اور اس کے اپنے کارڈ پر درج پتے پر وہ خود پہنچی۔ گھر والوں کو بتایا کہ وہ اس کے پاس ہے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ وہاں ٹھیک ہے اور اس کا علاج ہو رہا تھا۔

وہ اکثر اس کے پاس آ کر بیٹھتی۔ اب بس وہ خاموش رہتی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سامنے دیوار کو دیکھتی



رہتی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت مایوس تھی اسے زندگی کی طرف لانا تھا۔۔۔۔۔ پیار سے۔۔۔۔۔ اس کا اعتماد بحال کرنا تھا۔ وہ ٹھیک ہو رہی تھی۔ وہ بیمار ہی کب تھی وہ ایک وقتی شک میں تھی اب بہتر ہو رہی تھی اس کی حالت۔۔۔۔۔ ایک شام وہ اس کے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ وہ کتابوں کے ریک سے ”شاہ جو رسالو“ نکال رہی تھی۔

”تم نے شاہ لطیف کو پڑھا ہے۔۔۔؟“

”بہت۔۔۔۔۔ مگر بہت پہلے یونیورسٹی کے دور میں۔۔۔۔۔ آپ بھی تو وہیں تھیں۔۔۔۔۔“

”ہاں“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں شاہ جو رسالو کا کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟“

”سرا مٹھی ا“ اس نے بے اختیار کہا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن جیسے ہی رائیل کو یونیورسٹی سے فرصت ملی تو وہ فیضان سے ملنے کے لئے نکل پڑی۔ راستے میں وہ اس کے بارے میں خاکے بناتی رہی کہ وہ اپنے لہجے اور آواز کی طرح ہی خوبصورت ہوگا یا پھر بے حد عام سا بندہ ہوگا۔

جب وہ اس کے آفس پہنچی اور جیسے ہی اندر گئی تو پینٹ شرٹ میں لمبوس، درمیانی عمر اور بے حد اچھی شخصیت والا بندہ اسے دیکھ کر احرام اٹھا تھا کہ وہ اسے آنے کی اطلاع دے چکی تھی وہ ایک دم سے کچھ گھبرا گئی اور انک انک کر پولی۔۔۔۔۔

”جی۔۔۔۔۔ وہ!۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ رائیل ہوں۔“

”جی! میں ہوں فیضان احمد۔۔۔۔۔ تشریف رکھیں! Have a seat please“

رائیل اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی غیر معمولی ہینڈسم آدمی تھا مگر اسے لباس اور گفتگو کا سلیقہ تھا اس لئے وہ تھوڑی ہی دیر میں اسے ریلیکس کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اسے اپنے فورم ”مشعل“ کے بارے میں تفصیلات بتانے لگا اور جب اس نے رائیل کو اس کے میمبرز کی لسٹ دکھائی تو اس میں نہ فقط ادیب، شاعر، دانشور اور آرٹسٹ شامل تھے مگر ڈاکٹرز، وکلاء اور طلباء اور طالبات کی بھی بڑی تعداد

شامل تھی۔

وہ اردو اور انگریزی کس زبان بول رہا تھا اور لہجہ امریکن تھا۔ پتہ نہیں کیسے جیسے آج سے دس بارہ سال والی نوجوان رائیل جاگ اٹھی۔ اس نے اپنے کام کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ پینٹنگز کی نمائشوں کی تعداد، انگریزی اور اردو اخباروں میں آرٹ پر اپنے لکھے ہوئے آرٹیکلز اور آرٹسٹوں سے کئے گئے انٹرویوز کے بارے میں۔۔۔ وہ اپنی روانی میں بولتی رہی اور وہ اسے بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا اور سنتا رہا اور ساتھ میں کولڈ ڈرنکس کا دور بھی چلا۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کیسے دو گھنٹے گزر گئے۔

”رائیل صاحبہ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکال کر میرے پاس آئیں۔ مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ آپ میرے لئے بہت مددگار رہیں گی۔“

”فیضان صاحب آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کو اچھا رسپانس نہیں دیا دراصل میں خواب آرٹ اور سوشل سرکل سے بہت دور ہو چکی ہوں اور کوئی نئی پینٹنگ عرصے سے نہیں بنائی۔۔۔“

”اس کا سبب۔۔۔؟“

فیضان نے پوچھا تو رائیل کے چہرے پر پھر سے اداس رنگ چھا گیا اور اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں چھائی دیرانی اور اداسی اور بھی گہری ہو گئی۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی فیضان کو جیسے ہی ماحول کی گھمبیرتا کا احساس ہوا تو اس نے فوراً موضوع بدل دیا اور بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔۔۔

”Any ways ... میں نے جب آپ کے بارے میں سنا تھا تو مجھے لگا تھا کہ آپ چالیس سے اوپر کی خاتون ہوں گی کیونکہ آپ یونیورسٹی میں اسٹنٹ پروفیسر ہیں مگر آپ young ہیں۔“

رائیل کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ آگئی اور اس نے کہا۔۔۔

”کبھی کبھی نظریں بھی دھوکہ کھا جاتی ہیں میں نے جیسے ہی فائن آرٹس میں ماسٹر کیا تھا خوش نصیبی سے اسی سال میرا پائمنٹ یونیورسٹی میں بطور لیکچرر ہو گیا تھا جب کہ میں کم عمر تھی اور دوسری بات یہ کہ فقط ابھی کچھ ہی دن پہلے میری ترقی اسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر ہوئی ہے۔“

”اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔“ وہ اتنا ہی کہہ پایا۔

”آپ یہ بتائیں کہ آپ نے جو فورم بنایا ہے جس کے تحت ایک بہت ہی جدید اور نرالا میگزین نکالنا چاہتے ہیں تو آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ کو اس کا اچھا رسپانس ملے گا۔؟“ رائیل نے پوچھا۔  
 ”جی ہاں! بالکل!۔۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔۔

”جذبہ سچا ہو اور کام ایمانداری سے کیا جائے تو ناکامی کا کوئی سبب نہیں ہے۔“  
 ”مجھے آپ کے جذبے پر شک نہیں مگر میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے جس نے ہمارے ہاں پرنٹ میڈیا کو بہت بڑا دھچکا لگایا ہے۔ اب نہ تو پہلے کے جیسا ادبی اور علمی ماحول ہے نہ ہی وہ پرانا سوشل سیٹ اپ رہا ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ ہماری نئی نسل دوسرے ملکوں کے سنگرز، اداکاروں اور کھلاڑیوں کو زیادہ جانتی ہے مگر اپنی زبان کے بڑے شاعروں، مفکروں، دانشوروں اور آرٹسٹوں کا نام بھی نہ جانتی ہوگی۔ پھر۔۔۔ انٹرنیٹ کی دنیا کے ان ہاسیوں کو آپ کتابیں پڑھنے پر راغب کر پائیں گے۔؟“

”آپ درست فرما رہی ہیں ہمارے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ لوگ ہر نئی چیز کی طرف دوڑ لگاتے ہیں اور پرانی چیزوں کو بھول جاتے ہیں۔ ہماری ملک میں کسی دور میں پرنٹ میڈیا، ادب اور ریڈیو کا عوام پر بہت اثر تھا اور انہی mediums کے ذریعے ہمیں عظیم شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار، گلوکار اور اداکار ملے پھر جیسے ہی ٹی۔وی کا دور آیا تو لوگ اس کے اتنے دیوانے ہوئے کہ ریڈیو کو تقریباً بھلا ہی دیا اور اب تو سینکڑوں ٹی وی چینلوں ہیں تو لوگوں نے اپنے چینلو کو چھوڑ کر پڑوسی ملک یا دوسرے غیر ملکی چینلو کو دیکھنا شروع کر دیا۔۔۔ اور۔۔۔ آپ نے ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے یہ عام مناظر دیکھے ہوں گے کہ راستے میں آنے والے چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کے باہر لوگ چار پائی پر بیٹھے ہوئے چائے کے مزے لینے کے ساتھ ساتھ انڈین فلمیں دیکھتے نظر آئیں گے۔۔۔

دوسری طرف نیٹ نے پڑھے لکھے طبقے کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا ہے کہ وہ گھر والوں، محلے والوں اور رشتے داروں سے بھی کٹ کر رہ گئے ہیں اور جگہ جگہ نیٹ کیفیز ہیں جہاں نوجوانوں کا ہجوم ہوتا ہے جب کہ ترقی یافتہ ملکوں میں ایسی صورتحال نہیں ہے۔ وہاں پر الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے پرنٹ میڈیا اور ٹی وی کی وجہ سے ریڈیو کی اہمیت ختم نہیں ہوئی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ بی بی سی ریڈیو آف امریکہ اور ریڈیو ماسکوا بھی اتنے ہی مقبول ہیں اور ادب میں آج بھی کئی Best sellers چھپتے ہیں اور لوگ پڑھتے ہیں۔۔۔ اوہ

--- معاف کیجئے گا۔۔۔ میں شاید آپ کو بور کر رہا ہوں۔۔۔

”ارے نہیں فیضان صاحب! ایسی کوئی بات نہیں سچ پوچھیں تو مجھے بھی ہمارے اور ادیبوں کے بارے میں اتنا کچھ معلوم نہیں کہ آپ کا ادب میں اتنا کنٹریبوشن ہے مگر نہ تو میں آپ کے نام اور صورت سے واقف تھی نہ ہی کام سے۔۔۔۔۔ بلکہ میں تو آج ہی آپ کی ذات سے واقف ہوئی ہوں۔۔۔۔۔ باقی جہاں تک آپ کی تنظیم یا فورم ”مشعل“ کا تعلق ہے تو سچ پوچھیں تو میں خود ہمارے فنکاروں، ادیبوں، اور اعلیٰ طبقے سے کچھ زیادہ پر امید نہیں ہوں۔ ان کے پاس فقط لغائی ہوتی ہے اور میں نے ان میں سے اکثر کے قول و فعل میں تضاد دیکھا ہے۔۔۔۔۔ آپ جب کچھ کر کے دکھائیں گے تو یقین کروں گی۔۔۔۔۔“

”میرے قول و فعل میں آپ کو تضاد دکھائی نہیں دے گا۔۔۔“ فیضان نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”جو کام میں کر ہی نہیں سکتا اس کا ذمہ کبھی نہیں لیتا اور جس کام کو ہاتھ میں لے لوں تو پورا کر کے ہی دم لیتا ہوں۔ میں بہت جلد آپ کو خوشخبری سناؤں گا کہ میں نے جو خواب دیکھا ہے، اس کو عملی شکل دے دی ہے۔۔۔“

”میں آپ کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔

“Wish you best of luck !

رائیل انٹی تو وہ بھی اٹھا اور پھر اسے بہت عزت اور احترام کے ساتھ اس کی کار تک چھوڑنے آیا جہاں ڈرائیور نے اسے آتے دیکھ کر کار کا دروازہ کھول دیا تھا۔

واپسی کے سفر میں وہ فیضان کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ وہ خود اپنی اس تبدیلی پر حیران تھی۔۔۔ کیونکہ اس کا جیون تو جیسے ٹھہرا ہوا سنو لایا ہوا پانی تھا اور آج کی ملاقات ایک پتھر کی طرح سے تھی جو زور سے پانی پر گرا اور پانی میں ہلچل مچادی تھی اور دائرے دور دور تک پھیل گئے تھے۔

اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ اتنے سالوں بعد وہ اپنے روٹین سے ہٹ کر کسی اجنبی سے اتنی دیر تک ملی اور باتیں کی تھیں اسی وجہ سے اسے تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا ورنہ اور تو کوئی خاص سبب نہیں تھا

☆.....☆.....☆

علی حیدر زارا علی سے جتنا ہی پیار کا اظہار کرتا وہ اتنا ہی محبت کا انکار کرتی تھی کیونکہ۔۔۔۔۔



وہ علی حیدر سے پیار کرنا ہی نہیں چاہتی تھی  
یا۔۔۔ پھر۔۔۔ وہ اس سے پیار کر ہی نہیں سکتی تھی۔  
اس لئے۔۔۔ کہ۔۔۔

وہ اس سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یا۔۔۔ پھر۔۔۔ وہ اس سے شادی کر ہی نہیں سکتی تھی۔

علی حیدر کا معاملہ دوسرا تھا کیونکہ وہ مرد تھا۔ اس لئے اس کی طرح نہ خود کو چھپاتا تھا نہ ہی پیار کے اظہار میں  
جھجھکتا تھا۔ وہ زارا علی سے پیار کرنا چاہتا تھا یا نہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ اسے زارا سے محبت ہو گئی تھی۔ اور وہ برملا  
اظہار کر بیٹھتا تھا تب زارا اس سے کہتی۔

”علی! بہتر ہے کہ ہم اچھے دوست بن کر رہیں کیونکہ ناکام محبت کرنے سے کامیاب دوستی کرنا بہتر ہے۔“

”یہ کامیاب محبت اور ناکام محبت کیا ہوتی ہے؟“

”کامیاب محبت شادی کے بندھن میں بندھ جاتی ہے جب کہ ناکام محبت جدائی کے عذاب پر اختتام پذیر  
ہوتی ہے۔۔۔“ وہ دکھ سے کہتی ہے

”بھئی اس میں کیا مسئلہ ہے؟ میں علی حیدر ہوں اور تم زارا علی۔ تمہارے نام کے ساتھ علی تو جڑا ہوا ہی ہے  
بس ”حیدر“ کا اضافہ کر دو۔“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ یہ تم نہ کر پاؤ گے۔“ وہ جب یہ کہتی تو وہ ہمیشہ کی طرح خاموش ہو جاتا۔۔۔

حقیقت یہ تھی کہ علی حیدر اس کے سامنے کلی کتاب کی طرح تھا جب کہ وہ اپنے جذبات کو چھپاتی تھی مگر محبت  
”چاہنے“ اور ”نہ چاہنے“ کی محتاج نہیں ہوتی۔۔۔ سو پیار تو زارا علی کر بیٹھی تھی مگر اس کا اظہار نہیں کرتی تھی۔

ہاں شادی کے لئے ”چاہنا اور نہ چاہنا“ فرق رکھتا تھا مگر یہاں معاملہ ”کرنے“ کا نہیں تھا مگر ”کر سکنے“ کا  
تھا اور اس بات سے دونوں ہی واقف تھے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی شادی نہیں کر سکتے تھے۔۔۔ البتہ۔۔۔ محبت  
ان کی مرضی کی محتاج نہ تھی۔

☆.....☆.....☆

موسموں نے رنگ بدلا گرمی گئی اور جاڑا آ گیا۔۔۔ کیونکہ چھ ماہ کا وقت گزر چکا تھا۔ مگر رائیل کے لئے

سوائے موسم کی تبدیلی کے کوئی اور تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کی وہی روٹیں لائف تھی۔

رمضان کا بابر کت مہینہ آیا۔۔۔ اور پھر۔۔۔ عید بھی آئی۔۔۔ مگر اس کی عید میں تھا ہی کیا۔۔؟

عید کی نماز پڑھ کر آنے کے بعد بابا پیر و نے سو روپے کا نوٹ اسے عیدی کے طور پر دیا۔ بابا پیر و صرف ملازم ہی نہیں تھے بلکہ بچپن میں سب بھائی بہنوں کو گودوں کھلایا تھا اور پالا پوسا تھا اس لئے اسے گھر کے فرد کا سادہ درجہ حاصل تھا۔ جب بابا پیر و اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتا چلا گیا تو اس کا دل چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔۔۔ کیونکہ اسے ماضی کی اس گھر کی رونقیں یاد آنے لگیں تھیں اس گھر میں کتنی خوشیاں تھیں اور کیا رونقیں تھیں۔۔۔۔۔

رمضان کے آتے ہی سب بہن بھائی کتنا خوش ہوتے تھے ہر کوئی بابا پیر و کو سحری پر جگانے کا وعدہ لیتا اور بابا پیر و گرم پکوان ڈانگ ٹیبل پر سجا کر ان کو سحری کے لئے اٹھاتا تھا۔۔۔ پھر افطاری کے لئے امی مزے مزے کی ڈشز بناتی اور وہ بہنوں کے ساتھ مل کر کبھی چھوٹے تو کبھی فروٹ چاٹ اور شربت کا اہتمام کرتیں۔۔۔ اور چاند رات کو آڈنگ اور شاپنگ کے لئے جاتیں۔۔۔ جب پاپا اور بھائی عید کی نماز کے بعد مبارکباد دیتے۔۔۔ پھر عید کے دن لذیذ پکوان، وہ مزے۔۔۔ وہ شور شرابے تو بس یادوں میں ہی محفوظ رہ گئے تھے۔ اب نہ تو پاپا اس دنیا میں تھے نہ ہی ماما۔۔۔ ایک بھائی فیملی سمیت لندن میں مقیم تھے اور ایک کی پوسٹنگ اسلام آباد میں تھی۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ وہاں سیٹلڈ تھا دو بھائیوں کے بعد وہ خود بھی دونوں چھوٹی بہنیں شادی شدہ تھیں ان کی اپنی دنیا تھی اور ذمہ داریاں تھیں پھپھو جو بیوہ اور بے اولاد تھیں پاپا کی زندگی میں ہی ان کے ساتھ رہنے کے لئے آگئیں تھیں اور انہوں نے سب بہن بھائیوں کو گودوں کھلایا تھا اور اپنی اولاد سمجھ کر پالا پوسا تھا انہوں نے تو اسے ماں جیسا پیار ہی دیا تھا مگر پھر بھی ماں کے رشتے کا نعم البدل کوئی اور رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ سب کچھ یاد کر کے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے جو سو روپے کے نوٹ کو گیلیا کرتے رہے۔۔۔ انہیں ہاتھوں میں پاپا اور ماما کی طرف سے دی گئی عیدی ہزاروں میں ہوتی تھی۔ اب تو عید کا دن اتنا اداس اور تھکا دینے والا ہوتا تھا کہ اس کے لئے وقت کا ناعذاب بن جاتا تھا۔

جوں جوں شام ہوتی گئی اس کے دل کی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگی۔ وہ سوچنے

لگی کہ وہ کتنی بد نصیب تھی کہ اس کے والدین اس دنیا میں نہیں تھے اور بھائی بہن اس سے دور تھے۔۔۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود ماں ہوتے ہوئے اپنے بچے سے بہت دور تھی۔۔۔۔

اس کے بچے کو اس سے چھینا گیا تھا۔۔۔ اس کے دل کا جام دکھ سے لبریز ہو چکا تھا اور آنسوؤں کی صورت میں اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس وقت پھپھو کمرے میں داخل ہوئیں اور اسے یوں ہلکتے دیکھا تو دوڑ کر اپنی آغوش میں لیا اور دیر دیر سے سمجھانے لگیں۔۔۔۔

”بس بیٹا! مت رو۔۔۔ عید کے دن رو یا نہیں کرتے۔۔۔“

تب وہ تڑپ کر بولی۔۔۔

”پھپھو! میرے بس میں نہیں ہے میرا دل۔۔۔ کتنا رو کوں خود کو؟ میرا تو نصیب ہی خراب ہے۔ رونا ہی تو لکھا ہے مقدر میں۔۔۔۔“

”بیٹا! صبر کرو۔۔۔۔“ پھپھو ہلکتی رہیں۔۔۔

”اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا۔ مگر۔۔۔۔ رانیل بیٹا! تم بھی تو میری بات نہیں مانتیں۔ تم جوان ہو اور یہ زندگی اکیلے کیسے کاٹو گی۔۔۔ ایک دوا اچھے رشتے ہیں مگر تم ہو کہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہو۔۔۔۔“

وہ تڑپ کر اٹھی اور بولی۔۔۔

”پھپھو! کتنی مرتبہ میں نے کہا ہے کہ مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کریں کیا ایک تلخ تجربہ کافی نہیں ہے میرے لئے؟۔۔۔ مجھے شادی کی نہیں اپنے بیٹے کی ضرورت ہے۔ میں ماں ہوں کب تک اس کی جدائی میں تڑپوں گی؟۔۔۔ اب تو وہ بڑا ہو گیا ہو گا پتہ نہیں اس کے باپ نے اسے میرے متعلق کیا بتایا ہو گا۔۔۔؟ کیا خبر کہ وہ پھر کبھی مجھ سے ملے گا بھی یا نہیں۔۔۔؟“ رانیل پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور پھپھو اس کے آنسو پونچھنے کے لئے تسلیوں کے ٹشو پیپر ز اسے دیتی رہیں۔

☆.....☆.....☆

زارا علی اور حیدر علی کی ملاقات بہت عرصے کے بعد ہوئی تھی۔ وہ دونوں یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران کلاس فیلوز تھے اور تقریباً پانچ سال ساتھ گزارے تھے۔ ان دونوں کی اچھی انڈر سٹینڈنگ تھی کیونکہ وہ دونوں ہی

اپنی فیکٹری میں ادب اور آرٹ کی سرگرمیوں کی کمیٹی کے سرگرم رکن تھے۔ زارا نے انہی دنوں ادبی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اس کی کہانیاں اور آزاد شاعری کچھ ادبی جریدوں میں چھپ چکی تھی علی حیدر آرگنائزنگ کمیٹی کا ممبر تھا اور وہ بھی۔۔۔ اس طرح ان دونوں نے مل کر بہت شاندار مشاعرے، ادبی بیٹھکیں اور تصویروں کی نمائشیں منعقد کیں۔ اس کمیٹی میں دوسرے شعبوں کے اسٹوڈنٹس بھی شامل تھے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ ان کی کاوشوں کو سراہتی اساتذہ بھی بہت ہمت افزائی کرتے۔ اس کے ساتھ فواد احمد بھی تھا جو فائن آرٹس کا بہت قابل اسٹوڈنٹ تھا اور رائیل جو فائن آرٹس کی گڑیا سی اسٹوڈنٹ تھی، حسین سید بھی تھا جو کہ ایک انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ تھا ایک دوسرا سرگرم اسٹوڈنٹ بھی تھا شاہد ندیم۔۔۔ ان کے علاوہ اور لڑکے لڑکیاں بھی تھیں۔۔۔ ان ہی پروگرامز کو اکثر زارا اور علی حیدر کنڈکٹ بھی کرتے۔ دونوں ہی لاجواب کمپزنگ کرتے جس کی وجہ سے ان کو ریڈیو کے پروڈیوسر نے ریڈیو کے ایک شو کی کمپزنگ کے لئے بک کیا جو یونیورسٹی میں ان کے پروگرامز کی کوریج کے لئے آیا ہوا تھا۔ یوں ویڈیو پروگرامز کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جن میں اکثر وہ اور علی حیدر ساتھ ہوتے۔ آگے چل کر علی حیدر پروفیشنل ریڈیو جا کی بن گیا اور ٹی۔وی شوز بھی کرنے لگا مگر زارا فقط چند پروگرامز ہی کرتی کیونکہ بہر حال وہ ایک روایتی بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور لکھنے اور ریڈیو کے شوز کرنے تک ہی خود کو محدود رکھتی۔ جب اسے ٹی۔وی شوز کے لئے آفر ہوئی اور اس نے ایک دو پروگرام کئے ہی تھے کہ خاندان والوں نے اعتراض اٹھانے شروع کئے حالانکہ ان کی اپنی لڑکیاں زارا سے کئی درجہ زیادہ ماڈرن تھیں آزادوی سے آتی جاتی تھیں جب کہ وہ لباس کے معاملے میں بہت محتاط تھی خاص طور پر جہاں مرد ہوں زارا نے دیکھا کہ خاندان والوں کی الٹی سیدھی باتوں کی وجہ سے اس کی امی پریشان سی ہو گئی تو اس نے ٹی۔وی کو خیر باد کہہ دیا کیونکہ اس کے لئے رشتے اہم تھے ٹی۔وی شوز اور شہرت نہیں۔۔۔ اس کے والدین نے اپنے بچوں کو مناسب حد تک آزادی دی تھی اور ساتھ روایتیوں کی پاسداری بھی سکھائی تھی۔ البتہ ذات برادری کا لڑکے نہ ملیں تو باہر کہیں رشتے دینے کا سوال ہی نہیں تھا چاہے لڑکیوں کی شادیاں ہی نہ کی جائیں۔۔۔ اس طرح ان کے خاندان میں ان سے پہلے کی نسل کی خواتین کی شادیاں نہ ہو پائیں اور وہ ساری عمر اپنے گھروں میں بیٹھ رہیں۔ روایتیں توڑنے کا تصور ہی نہ تھا۔

اسٹوڈنٹ لائف ختم ہوئی تو ہر کوئی اپنی اپنی راہ لگ گیا۔ مگر زارا کا رابطہ شاہد ندیم اور حسین سید سے رہا۔ شاہد



ندیم سے اس لئے کہ وہ ایک سرکاری ادارے میں ادبی جریدے کا ایڈیٹر بن گیا اور اس سے اپنے ادبی جریدے کے لئے کچھ نہ کچھ لکھواتا ہی رہتا تھا اور دوسرا حسین سید تھا۔۔۔ جو زارا میں النوالو ہو گیا تھا اور اس سے محبت کا اظہار بھی کر چکا تھا۔ زارا کے لئے یہ ایک خوش آئند بات تھی کیونکہ وہ اسی کے ذار برادری کا تھا ورنہ وہ اتنی پیاری اور ٹیلنٹڈ تھی اور پھر ادبی دنیا سے بھی وابستہ تھی اس لئے کئی لڑکے، ادیب، شاعر اسے پسند کرتے تھے مگر جانتے تھے کہ ان کی دال نہیں گلنے والی اس معاملے میں۔۔۔

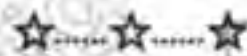
زارا بھی اپنی خاندانی روایات سے آگاہ تھی اس لئے اسے حسین سید مناسب لگا کہ اس کا مستقبل روشن تھا وہ انجینئر بن چکا تھا یوں وہ دونوں قریب آ گئے۔ مگر اس کی ماں اس کی شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہتی تھی اور انہیں راضی کرنا بھی ایک ٹاسک تھا حسین کے لئے۔۔۔ زارا کو اس سے دلی لگاؤ تھا بھی یا نہیں مگر اس نے اسے اس لئے قبول کر لیا تھا کہ اس کے پاس کوئی اور چوائس نہیں تھی۔ وہ اپنی کزنز کی طرح ذات برادری کے میٹرک یا انٹر پاس زمینداروں سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی جو عورت کو کم تر سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی ڈاکٹر اور لیکچرر کزنز کو بھی روایتی لوگوں سے شادی کر کے لڑتے، روتے اور پھر کپروماز کرتے دیکھا تھا۔ وہ شادی کے نام پر کپروماز نہیں بلکہ اچھا جیون ساتھی چاہتی تھی اگر ذات برادری کا مسئلہ نہ ہوتا تو ان ہی لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مناسب لڑکوں کے رشتوں کی کمی نہ ہوتی جب کہ ان کے ذات برادری کے لڑکے زمینداری ہی کرتے۔ بہت کم اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور وہ خود کو بہت اعلیٰ تر سمجھتے کہ پتہ تھا کہ بیٹیوں کے رشتوں کی مجبوری کی وجہ سے مائیں اپنی بیٹیوں کو آگے کرتیں تو وہ خود کو شہزادے سمجھتے اس صورتحال میں حسین زارا کو بہت مناسب لگا خوش شکل تھا۔ انجینئر تھا اور رائٹر بھی تھا اس لئے ادب سے وابستگی کی وجہ سے دونوں کا اچھا ساتھ رہتا مگر اس کی ماں کو زارا کی ادب سے وابستگی اور ریڈیو پر شو کرنا پسند نہیں تھا۔ یا پھر اپنی بھتیجی کی شادی اس سے کرنے کے لئے اس نے یہی بہانہ بنایا تھا انکار کا ورنہ ان کی بھتیجی زارا سے زیادہ الزام ڈالتی اور وہ بھی زارا کی طرح ہی یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھی۔

حسین اس سے کہتا کہ وہ ماں کو منالے گا اسے ٹائم چاہئے اور زارا کے پاس اسے ٹائم دینے کے علاوہ اور کیا چارہ تھا۔ اسے ایک سرکاری کالج میں لیکچرر شپ مل گئی۔ اس نے خود کو پڑھانے اور لکھنے میں مصروف کر دیا۔ اس

نے اپنے افسانوں کا مجموعہ آصف کے حوالے کر دیا کیونکہ اس کی پبلشرز سے جان پہچان تھی۔ زارا کو اندازہ تھا کہ شاہد اسے پسند کرتا تھا اور وہی تو تھا جو حسین کو لے کر آیا تھا اور اسے بھی لٹری سوسائٹی کے یونیورسٹی پروگرامز میں اپنی تخلیقات پڑھنے کے لئے لاتا تھا۔ شاہد نے شروع شروع میں دبے لفظوں میں اور اشاروں کنایوں میں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا مگر جب اس نے حسین اور زارا کا ایک دوسرے کی طرف جھکاؤ دیکھا تو خاموشی سے پیچھے ہٹ گیا اور کہا تھا۔۔۔

”مجھے پتہ ہے کہ ہمارے اسٹیلٹس اور ذات برادری میں فرق ہے۔ آپ کو حسین ہی زیادہ سوٹ کرے گا۔ میں آپ لوگوں کے بہتر مستقبل کے لئے دعا گو ہوں۔“

اس کا رویہ حسین سے بھی اچھا تھا اور اس کی تحریریں بھی اپنے میگزین میں چھاپتا علی حیدر کسی این۔ جی۔ او سے وابستہ ہو کر پرائیکٹس کے سلسلے میں شہروں شہروں گھومتا اس لئے اس سے رابطہ نہ رہا تھا۔



عید کے دوسرے دن اس کی بہنیں اپنے بچوں سمیت رائیل سے ملنے کے لئے آگئیں تو گھر میں رونق ہو گئی مگر رات کو وہ واپس گئیں تو گھر پھر ویران سا ہو گیا۔ اب دل کو بہلانے کی خاطر وہ ٹی۔ وی لاؤنج میں آگئی جہاں عید کے خصوصی ڈرامے کو دیکھتے ہوئے شفن اور گلاں زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اس نے بھی بہت کوشش کی کہ وہ بھی اس میں دلچسپی لے سکے مگر ناکام رہی اور پھر واپس اپنے کمرے میں آگئی جہاں پر بیڈ کی سائیڈ پر پڑے موبائل کی رنگ بج رہی تھی۔۔۔

کس کا فون ہے اس وقت۔۔۔ اس نے سوچا اور اٹھا کر دیکھا تو فیضان احمد کا نام چمک رہا تھا وہ حیران ہوئی اور کال ریسیو کی۔

”رائیل صاحبہ! فیضان احمد بات کر رہا ہوں۔۔۔“

نہ جانے کیوں اس کی آواز سن کر اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

”آپ کو یاد ہے نا۔۔۔ ہماری ملاقات ہوئی تھی۔“

”جی۔۔۔“ وہ کچھ اور نہ کہہ پائی۔۔۔

”سب سے پہلے تو عید کی مبارک باد قبول کریں حالانکہ عید کا دوسرا دن بھی گزر چکا ہے۔“ وہ بولتا رہا نہ جانے کیوں اس وقت رائیل کو اس کا فون کرنا اچھا لگا تھا کیونکہ اس کا دل بہت اداس ہو رہا تھا اس لئے کسی سے بات کرنا چاہتی تھی تھوڑی تبدیلی چاہتی تھی موڈ میں اس لئے اس نے خوش دلی سے کہا۔۔۔

”کوئی بات نہیں، میں پھر بھی قبول کرتی ہوں۔۔۔“

”تھینکس! آج میں نے اس لئے کال کی ہے کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں کچھ کر کے ہی دکھاؤں گا تو عرض ہے کہ میرا خواب میرا ادبی مخزن تیار ہو چکا ہے جس میں آرٹ کا حصہ بھی رکھا گیا ہے جس میں نامور فنکاروں کی ڈائریکٹری بھی ہے۔ جب پرچہ چھپ جائے گا تو اس کی رونمائی کی تقریب بھی کی جائے گی اور ساتھ میں ان آرٹسٹوں کے آرٹ کی نمائش بھی رکھی جائے گی۔ اس سلسلے میں مجھے آپ کی مدد کی اور تعاون کی ضرورت پڑے گی۔ کیا آپ تھوڑا سا وقت نکال کر میرے آفس آنے کی زحمت کریں گی؟“

رائیل کا دل پھر بجھ گیا۔ اسے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی کہ وہ تو کب سے ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینا چھوڑ چکی تھی۔ اس نے بیزاری سے کہا۔

”میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔“

”پلیز۔۔۔۔۔“

”میں سوچوں گی۔۔۔“

”ایک دو دن کے اندر آئیے گا۔“

پھر اس نے الوداعی کلمات ادا کر کے کال بند کر دی۔

رائیل کہاں ایسی گزارشوں پر دھیان دینے والی تھی سو کچھ دنوں کے بعد اس نے پھر کال کی۔۔۔

”آپ کیوں نہیں آئیں؟ میں نے آپ کا بہت انتظار کیا۔۔۔“ اس نے شکوہ کیا تو رائیل کو غصہ آ گیا۔

”فیضان صاحب! کیا آپ سچ سنتا چاہتے ہیں؟“

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ بالکل۔۔۔“ وہ بڑی خوش دلی سے بولا۔

”تو پھر سنیں۔۔۔۔۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔

”سچ یہ ہے کہ میں آپ کے پاس آنا ہی نہیں چاہتی میں اب ایسی سرگرمیوں کو چھوڑ چکی ہوں۔۔۔“

”مگر۔۔۔ کیوں؟“

”مجھے نہیں پتہ۔۔۔“

”اگر ماسٹرنہ کریں تو ایک بار پوچھوں؟“

”جی پوچھیں۔۔۔“

”Are you married?“ (کیا آپ شادی شدہ ہیں؟)

”i was married“ (میں شادی شدہ تھی)

”مطلب؟“

”شادی کے دو سال بعد مجھے طلاق مل گئی تھی۔“

”اوہ۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔“ ایک لمحہ ٹھہر کر اس نے پھر پوچھا۔

”بچے؟“

”ایک بیٹا ہے جسے باپ اپنے ساتھ امریکہ لے گیا تھا۔۔۔ اور کچھ پوچھتا ہے؟“

”پلیز! آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ دراصل میں پانچ سال کے بعد وطن لوٹا ہوں اس لئے مجھے ذاتی طور پر

آپ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں محض ایک دوست سے آپ کا میل نمبر ملا کسی اور سے یہ سب کچھ پوچھنا

مناسب نہیں سمجھا اس لئے آپ ہی سے پوچھ رہا ہوں۔“

”میں بھی اب آپ کے بارے میں جاننا چاہوں گی۔“

”جی۔۔۔ ضرور۔۔۔“

”آپ شادی شدہ ہیں؟“

”نہیں۔“

”سبب؟“

”بھئی میں تو ہوں سیلانی ٹائپ کا بندہ سیر و سفر کرنا میرا شوق ہے سو آج یہاں توکل وہاں۔۔۔ کتنی ہی جابز



کیس اور چھوڑ دیں۔۔۔ پھر۔۔۔ ایسے سر پھرے انسان سے کون سی لڑکی اپنا سر پھوڑے گی۔۔۔ خیر۔۔۔ تو میں پوچھ رہا تھا کہ آپ کیوں نہیں آئیں میرے آفس؟“

”میں غالباً اس سوال کا جواب دے چکی ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے ساتھ جو ٹریجڈی ہوئی ہے اس کے سبب آپ ساری دنیا سے ناراض ہیں مگر۔۔۔“

رائیل بے اختیار غصے میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔۔۔

”مگر۔۔۔ کیا؟۔۔۔ آخر آپ کو صرف میں ہی کیوں نظر آتی ہوں؟ اتنے سارے آرٹسٹ ہیں۔۔۔ میں ہی کیوں آؤں؟“

فیضان نے اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے آپ سے عرض کیا کہ پرچے کی رونمائی کے ساتھ پینٹنگز کی نمائش بھی رکھی گئی ہے اور اس سلسلے میں، میں دوسرے آرٹسٹوں سے مل کر ان کا پروفائل بنا چکا ہوں صرف آپ رہ گئی ہیں اس لئے چاہتا تھا کہ آپ تشریف لائیں تو آپ کا پروفائل بھی بن جائے گا اور نمائش کے انتظامات بھی دیکھ لیجئے گا۔“

رائیل نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پھر بولا۔

”آپ آئیں گی ناں۔۔۔“

”ابھی؟“

”ہاں“

”نہیں“

”کیوں؟“

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے جان چھڑائے تو جھٹ سے کہہ دیا۔

”اس وقت ڈرائیور موجود نہیں ہے۔۔۔“

”میں آپ کو گھر سے پک کر لوں؟“

”اس کی ضرورت نہیں۔“

”پھر میں خود آپ کے گھر حاضر ہو جاؤں؟“

”نہیں۔۔۔“ اس نے ٹکاسا جواب دیا۔

”میں کسی کو بھی اپنے گھر نہیں بلاتی۔“

فیضان ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”نہ آپ آنے کو تیار ہیں اور نہ ہی مجھے آنے کی اجازت ہے۔۔۔ تو پھر کام کیسے بنے گا؟“

”آپ فکر نہ کریں میں اپنا پروفائل خود آپ کو بھجوا دوں گی۔“ اس نے حل بتایا۔

”چلیں یونہی سہی۔“

فیضان نے کال بند کی تو وہ اس کے بارے میں سوچتی رہ گئی کہ یہ کیسا عجیب شخص ہے اس پر اس کی بے رخی کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔ اس سے ملاقات کے دوران اس نے یہ بات محسوس کی کہ اس کے اندر جیسے کوئی نیا اور انجانا احساس جاگا تھا۔ پہلے نہیں کیا خاص بات تھی اس میں جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ اس کی مرضی اور موڈ کے خلاف جب اس سے بات کرتا تو وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے سخت رو یہ نہیں رکھ پاتی تھی۔ اس کی شخصیت بھی بہت پیاری لگی تھی اسے حالانکہ وہ بہت کم لوگوں سے frank ہو پاتی تھی مگر اس نے اسے کچھ ایسا اعتماد دیا تھا کہ جیسے وہ برسوں سے اسے جانتی ہو شاید اس میں اپنی بات منوانے کا tact تھا۔ تب ہی تو نہ فقط وہ اس سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے اپنی ہر بات منواتا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

چند سال یونہی گزر گئے۔ معاملہ اٹکا ہی رہا۔ حسین کی ”آئی لو یو“ کی رٹ تو رہتی مگر اپنی ماں کو راضی نہ کر سکا۔ اس دوران زارا کی کتاب چھپ کر آگئی تو شاہد نے کہا۔

”آپ کی کتاب کی رونمائی کا شاندار پروگرام ہونا چاہئے۔“

”بالکل۔ مل جل کر کریں گے۔“

زارا نے خوشی سے یہ بات حسین کو بتائی تو وہ بھی خوش ہوا۔ اس نے تو سوچا کہ وہ اس کی کتاب کی رونمائی

کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا مگر وہ کسی ناکی مصروفیت کا سبب بنا کر معذرت کر لیتا۔

ایک دن زارا خود آڈیٹوریم کی بنگ کی آرٹ سرکل پہنچی وہاں چیننگنگز کے ڈسپلے ہال کے علاوہ ایک آڈیٹوریم بھی تھا جہاں ڈرامے، تھیٹر وغیرہ بھی ہوتے اور ادبی پروگرام بھی منعقد کئے جاتے تھے۔ جب انچارج کے آفس میں پہنچی تو پتہ چلا کہ وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔

”فواد صاحب کو بلاؤں؟ وہ بیٹھے ہیں۔“ چڑا سی نے کہا۔

”یہ کون صاحب ہیں؟“ زارا نے پوچھا

”آرٹ گیلری کے انچارج ہیں۔“

”اچھا بلاؤ۔ انہی سے پوچھ لوں گی بنگ کے متعلق۔“

تھوڑی دیر میں جو صاحب اندر آئے ان کو دیکھ کر زارا چونکی اور وہ زارا کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔

”میں زارا۔۔۔ آپ؟“

وہ فواد احمد تھا یونیورسٹی کے دور کا جب وہ لوگ مل کر آرٹ اور ادب کے پروگرام اربج کرتے۔

”فواد صاحب۔۔۔ آپ! خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر یہاں۔“

”بھئی میں فواد احمد ہوں۔۔۔ صاحب نہیں۔“

وہ ہنس کر سامنے والی کرسی پر بیٹھا تو زارا نے اسے بتایا کہ وہ ہال کی بنگ کے لئے آئی تھی اور پھر مختصر طور پر رونمائی اور اپنی کتاب کے بارے میں بتایا۔ زارا نے محسوس کیا کہ وہ پلکیں چمپکائے بغیر بس اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اس کے اس انداز پر گڑبڑا کر رہ گئی۔

”آپ یہاں کب سے ہیں؟“ زارا نے پوچھا تو وہ جیسے ہوش میں آ کر بولا۔

”ایک سال ہو گیا ہے۔“

اتنے میں چڑا سی کو لٹڈرنک لے آیا اور ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔

”بہت خوشی ہوئی آپ کو یہاں اتنی اچھی جگہ پر دیکھ کر۔ آپ کا آرٹ کا کام کیسا چل رہا ہے؟“

”چلیں میرے آفس میں وہاں دکھاؤں میرا نیا کام۔“

”پھر کبھی چلیں گے فواد صاحب آج تو مجھے صرف آڈیو ریم کی بنگلہ کروانی تھی۔“

”وہ اب آپ کا نہیں میرا مسئلہ ہے ہو جائے گی بنگلہ آپ اپنا کاٹیکٹ نمبر دے دیں میں کنفرم کر کے اطلاع دے دوں گا۔“

”بہت بہت شکریہ فواد صاحب!“ وہ اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے بولی۔

”بھئی شکریہ کس بات کا؟ ہم لوگوں نے مل کر یونیورسٹی میں کتنے پروگرام کئے تھے میں وہی فواد ہوں۔ کوئی صاحب صاحبہ نہیں۔“

زارا نے ایک مرتبہ پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور آفس سے نکل آئی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن اپنے وعدے کے مطابق راتیل نے اپنا پروفاؤل ڈرائیور کے ذریعے فیضان کو بھجوایا اسی شام پھر اس کی کال آئی تھی۔

”آپ کو پروفاؤل ملا؟“ اس نے پوچھا

”جی ہاں وہ تو مل گیا مگر اس میں آپ کی پیدائش کا سن شاید غلط لکھا گیا ہے۔“ وہ بولا

”میں تو سمجھتی ہوں کہ کوئی غلطی نہیں ہوگی کیونکہ میں نے اسے اچھی طرح پڑھا تھا۔“ وہ حیران ہو کر بولی

”تو پھر۔۔ یقین تو نہیں آتا۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا میں نے اپنی عمر چھپائی ہے؟“ وہ ایک دم بگڑ گئی۔

”ارے۔۔۔ نہیں۔۔“ وہ پریشان ہو کر بولا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ یقیناً لکھنے میں کچھ غلطی ہوئی ہے کیونکہ اس حساب سے آپ پینتیس سال کی ہونے والی ہیں۔“

”یہ تو صحیح ہے۔“

”کمال ہے! خواتین تو اپنی عمر چھپاتی ہیں اور آپ تو پینتیس کی لگتی بھی نہیں پھر بھی بتاتی ہیں۔“

”بڑی مہربانی ہے آپ کی ان کمٹنس کے لئے۔۔۔“



رائیل کے لہجے کی تلخی برقرار رہی پھر وہ ایک دم بولی۔

”ہائے دادے۔۔۔ مرد تو عمر نہیں چھپاتے۔۔۔ تو پھر میں آپ کی عمر بھی معلوم کرنا چاہوں گی۔“

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ میری عمر 38 سال ہے۔“

”واقعی؟ مگر آپ تو بہ مشکل بتیس تینتیس کے لگتے ہیں۔“

”پھر تو حساب برابر ہو گیا۔“ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”ہائے دادے۔۔۔ آپ نے کیا صرف میری عمر معلوم کرنے کے لئے کال کی ہے؟“

”اوہ نہیں۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کے پروفائل میں آپ کی ایک بھی تصویر نہیں ہے جب کہ باقی

آرٹھٹوں کے photographs مجھے مل چکے ہیں۔“

”میں ضروری نہیں سمجھتی۔“

”بالکل ضروری ہے۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

”فیضان صاحب بہت عرصہ ہوا میں آرٹ سرکل کو چھوڑ چکی ہوں میں نے رسالوں وغیرہ میں کب کے

انٹرویو دینے چھوڑ دیئے ہیں۔ آپ کے اتنے اصرار پر میں نے اپنا پروفائل بھیجا ہے ورنہ مجھے اب کسی بھی چیز

سے دلچسپی نہیں رہی ہے۔“

”لیکن۔۔۔ آخر کیوں؟“ وہ خاموش رہی تو وہ پھر بولا۔

”اور یہ آپ کے چہرے پر اتنے سنجیدہ اور رنجیدہ تاثرات کیوں چھائے رہتے ہیں؟ پہلی ملاقات میں مجھے

ایسا لگا کہ میں کسی لیڈی سٹراٹ بقراط سے بات کر رہا ہوں۔ کیا آپ ہمیشہ ایسی ہی سنجیدہ اور اداس رہتی ہیں؟“

”پتا نہیں۔۔۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا اس بات پر۔“ وہ ہنسی سے بولی

”تو پھر کون غور کرے گا رائیل جی؟“ وہ شرارت سے بولا

”آخر مطلب کیا ہے آپ کا؟“

”مطلب ہے کہ۔۔۔ کبھی ہنسا اور مسکرایا بھی کریں۔“

”بڑی مہربانی مشورے کی۔۔۔“ وہ رکھائی سے بولی۔

”You are welcome!....“ پھر تصویر کب ملے گی؟“

”فیضان صاحب! میں لفظوں میں تو آپ کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی۔“

”کیسے کر پائیں گی؟ ہم ادیب تو ہوتے ہی لفظوں کے کھلاڑی ہیں۔۔۔ کب ملے گا فوٹو؟“

”اچھا بابا!۔۔۔ کل مل جائے گا۔“

”تھینک یو۔۔۔“ پھر وہ رکا۔۔۔ پھر بولا

”رائیل صاحبہ!“

”جی؟“

”اپنا بہت خیال رکھا کریں۔“

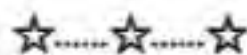
”شکریہ۔“ کہہ کر رائیل نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ وہ عجیب سے ایک احساس میں گھر گئی اور سوچا کہ اس کے روکھے سے رویے کی وجہ سے لوگ اسے rude کہتے اور کسی کو اس سے بے تکلف ہونے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی مگر اس شخص پر اس کے لہجے اور رویے کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ اپنا ازلی حق سمجھتے ہوئے دیدہ دلیری سے اس کی زندگی میں داخل ہو رہا تھا۔ اسے اس کی صاف گوئی ہی اچھی لگتی تھی وہ بغیر کسی لپٹی کے اپنی بات کہہ دیتا تھا۔ وہ ان منافقوں سے کہیں بہتر تھا جو بظاہر تو اخلاقی خول اپنے اوپر چڑھائے رکھتے ہیں مگر اندر سے بھیڑیے ہوتے ہیں۔ مگر اس کے لہجے میں پتہ نہیں ایسا کیا تھا۔۔۔ محبت تھی۔۔۔ اپنائیت تھی۔۔۔ یا نہ جانے کیا تھا اس وقت اس کے کانوں میں فقط اس کے کہے ہوئے جملے کی گونج تھی۔

”اپنا بہت خیال رکھا کریں۔۔۔“

”اپنا بہت خیال رکھا کریں۔۔۔“

”اپنا بہت خیال رکھا کریں۔۔۔“

اس کے چہرے پر کئی سالوں کے بعد ایک بے اختیاری مسکراہٹ آگئی تھی جو دل کی گہرائیوں سے تھی۔۔۔ مگر آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی تھی۔



زارا کے کتاب کی رونمائی کے کارڈز کی پرنٹنگ سے لے کر میڈیا کوریج کی ذمہ داری شاہد نے لے لی اور رفریشمنٹ کی ذمہ داری زارا نے خود لے لی۔ حسین نے وعدہ کرنے کے باوجود کوئی کام اپنے ذمے نہ لیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے یاد دلانے کہ اس نے تو اسے مستقبل کے سہانے سنے دکھاتے ہوئے کہا تھا۔

”تمہاری ہر کتاب چھوٹا میری ذمہ داری ہے میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ رہوں گا۔“

دوسری طرف فواد احمد نے آڈیو ریم کی کنفرمیشن کی اطلاع کے ساتھ کہا۔

”آپ تھوڑا تاخیر دے سکتی ہیں مجھے؟“

”کس لئے؟“

”میں آپ کا پورٹریٹ بنانا چاہتا ہوں“

”مگر مجھے اپنا پورٹریٹ بنوانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”آپ کی شادی ہو چکی ہے؟“ اچانک فواد نے پوچھا

”نہیں۔۔۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ زارا نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ارے ہم یونیورسٹی فیلور ہے ہیں سالوں کا ساتھ تھا تو کیا اتنے عرصے کے بعد ملے ہیں تو ایک دوسرے

کے بارے میں پوچھ بھی نہیں سکتے؟“

”آپ کی شادی ہو گئی یا نہیں؟“ زارا نے جھلا کر کہا۔

”نہیں!“

”کیوں؟“

”ہم آرٹسٹ لوگ اول جلول ہوتے ہیں عام لڑکیاں ان کو سمجھ نہیں پاتیں اور ان کی شادیاں عموماً ناکام

ہوتی ہیں۔“

”فضول بات۔ آپ کو کوئی بھی بیماری لڑکی مل سکتی ہے۔“

”آپ کریں گی مجھ سے شادی؟“

وہ تڑ سے بولا تو اس کا تو دماغ ہی گھوم گیا اور غصے سے ”شٹ اپ“ کہتے ہوئے کال ڈسکنیکٹ کر دی

۔ اس کا سرگھوم کر رہ گیا فواد کی بات سن کر۔

☆.....☆.....☆

کچھ دن ہی گزرے تھے کہ فیضان نے پھر کال کی۔

”جی فیضان صاحب! کیسے مزاج ہیں؟“ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”اللہ کا کرم ہے۔ کام بہت تیزی سے جاری ہے میگزین چھپائی کے آخری مراحل میں ہے۔ اب جیسے ہی وہ چھپ جائے گا تو اس کی رونمائی کا شاندار پروگرام کیا جائے گا ساتھ میں ان تمام آرٹسٹوں کے آرٹ کی نمائش بھی رکھی جائے گی جن کے کام کے متعلق اس اشو میں مضامین ہیں۔ تو جناب باقی سب لوگوں نے تو اپنی پینٹنگز دے دی ہیں سوائے آپ کے۔“

”ٹھیک ہے میں کل بھجوا دوں گی۔“

”بھجوانے کے بجائے اگر آپ خود آجائیں تو بہتر ہوگا۔ آکر انتظامات تو دیکھیں ایگزیشن کے بلکہ بہتری کے لئے مشورے بھی دیں۔۔۔ اور دیکھیں اب کی بار انکار مت کیجئے گا۔“

”فیضان صاحب! کتنی مرتبہ یہ بات دہراؤں کے میں نے ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینا کب کا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں میری تصویروں کی نمائش اتنا کچھ بھی میں نے آپ کے اتنے اصرار پر کیا ہے۔ مجھے اب active ہونے کا کوئی شوق نہیں۔“

”لیکن۔۔۔۔ آخر کیوں؟ ایسی کیا بات ہوئی ہے کہ آپ مثبت رویہ اختیار کرنے کے بجائے منفی رویہ اپنائے ہوئے ہیں؟ آپ جیسے تخلیقی آرٹسٹ تو منفی دائروں کو توڑتے ہیں۔۔۔ اور آپ۔۔۔“

”یہ میرا فحشی معاملہ ہے۔۔۔۔۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر تلخی سے بولی۔

”گلتا ہے آپ نے اپنے آپ پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے۔“

”ہاں! نہیں ہے مجھے کسی پر اعتماد۔ اپنے آپ پر بھی نہیں۔“

”دیکھیں محترمہ! سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے اور۔۔۔ میری ایک بات یاد رکھیے گا۔ زندگی میں اگر کوئی اچھا انسان ملے تو اس پر اعتماد کیجئے گا اور اس کی حوصلہ شکنی مت کیجئے گا۔“



”بہت بہت شکریہ اس مشورے کا“ اس کے لہجے میں اب بھی بہت تلخی تھی۔

”کل آپ کو پینٹنگز مل جائیں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ کچھ دنوں بعد گرینڈ پروگرام ہوگا۔ اس میں تو آئیں گی نا؟“

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے۔ بہت شکریہ! جب کارڈز چھپ کر آجائیں گے تو پھر آپ سے رابطہ کروں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

☆.....☆.....☆

کچھ دنوں کے بعد پھر فواد نے کال کی تو زارا کا دل چاہا کہ کال اٹینڈ نہ کرے مگر کتاب کی رونمائی ہونے والی تھی سو سوچا کہ شاید کوئی اہم بات ہو۔۔۔

”جی!“ اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا

”اوہو!۔۔۔ اب تک غصے میں ہیں۔ میری اس دن کی بات بری لگی آپ کو؟“

”تو آپ کے خیال سے مجھے خوش ہونا چاہئے تھا؟“

”ارے۔۔۔ پروپوز ہی کیا تھا ناں آپ کو کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ قبول کرنا یا رد کرنا آپ کے اختیار میں ہے آپ تو بچوں کی طرح ری ایکٹ کر رہی ہیں۔ آپ تو خود ادب سے وابستہ ہیں انسانی جذباتوں سے آگاہی رکھتی ہیں سوری! پھر کبھی ایسی بات نہیں کروں گا۔“

یہ سن کر وہ تھوڑی نرم ہوئی اور کہا۔۔۔

”آپ نے بھی ایک دم ہی کہہ دیا ناں۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ میری گفتنی ہو چکی ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ میں پہلے سے کسی میں انوالو ہوں۔“

”ہم آرٹسٹ لوگ ایسا sense کہاں رکھتے ہیں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

”یقین کریں کہ آپ کو بہت اچھی لڑکی مل سکتی ہے آپ خوش شکل ہیں اچھی پوسٹ پر ہیں۔“

”ارے نہیں!۔۔۔ مجھے شادی کرنی ہوتی تو کب کا کر چکا ہوتا۔ آپ کو دیکھا تو خیال آیا ورنہ میں تو شادی

کروں گا ہی نہیں۔“

”کیا اس دن آپ نے مجھے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ہم سالوں تک یونیورسٹی فیلور ہے ہیں۔“

”ہاں!۔۔۔ مگر جب مجھے واقعی آپ کے لئے ایسا احساس نہیں جاگا۔ اس دن ایک لمحے میں نجانے ایسا کیا

ہوا کہ میرے دل میں آپ کو پروپوز کرنے کا خیال آیا تھا۔ یہ تو دلوں کے معاملات ہوتے ہیں۔“

”چھوڑیں دلوں کے معاملات یہ بتائیں کہ اسٹیج ڈیکوریشن اور سینک ہمیں ہی کرنی ہوگی ناں؟“

”آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ آپ مجھے تفصیلات بھیجیں میں کر لوں گا۔“

”جھینکس!“

”پورٹریٹ بنانے کے لئے ٹائم دیں۔“

”نہیں بنوانا مجھے۔۔۔ پلیز!“

”میں آپ کے گھر آ جاؤں گا۔“

”نوا!“

”او کے!“

کال ڈسکنیکٹ کر کے زارائے حسین کو کال کی۔۔۔

”حسین! آؤ گے ناں میری کتاب کی رونمائی میں؟“

”ہاں بھئی! کیوں نہیں۔“

”اتنے بجے بجھے سے کیوں ہو۔“

”ارے! کچھ نہیں تھکا ہوا ہوں۔“

”میں آج کل کی بات کر رہی ہوں۔“

”کچھ نہیں ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”انشاء اللہ!“

☆.....☆.....☆

پھر یہ ہوا کہ ان دنوں وہ ہر روز ہی کال کیا کرتا بظاہر تو کسی نہ کسی کام سے مگر کام تو صرف بہانہ ہوتا۔ وہ بھی سمجھتی تھی کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا اس کی بات سن کر کبھی تو وہ اسے بہت سچا اور کھرا انسان لگتا تو کبھی انتہائی شاطر وہ اس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی کہ اس سے زیادہ رابطہ رکھنا چاہئے بھی یا نہیں۔ لیکن عجیب بات تھی کہ اگر ایک دن اس کی کال نہیں بھی آتی تھی تو وہ غیر شعوری طور پر اس کی کال کا انتظار کرتی۔ وہ خود تو کبھی بھی اسے کال نہیں کرتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے کال کر کے کہا۔

”سوری رائیل صاحبہ! آپ کو پھر زحمت دے رہا ہوں۔ دراصل پروگرام کے کارڈز چھپ کر آچکے ہیں میں نے آپ کے لئے کچھ علیحدہ کیے ہیں تاکہ آپ اپنی فرینڈز یا کولیگز کو بھی دے سکیں۔“

”نہیں۔۔۔ میری کوئی خاص فرینڈ نہیں ہیں۔ ایک دو ہی بھیج دیں میں ڈرائیور کو بھیجتی ہوں لینے کے لئے۔“

”مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ خود آجائیں اور پیسٹنگز کا ڈسپلے تو دیکھیں ویسے تو میں آفس میں شام ساڑھے سات تک بیٹھتا ہوں مگر میں آٹھ بجے تک آپ کا انتظار کروں گا۔“

یہ کہہ کر اس نے کال ہی ڈسکنیکٹ کر دی تو وہ ایک دم گم سم سی ہو گئی یہ کیا؟۔۔۔ اس نے تو اسے امتحان میں ڈال دیا تھا وہ سوچتی رہی۔۔۔

آخر ایسی کیا بات تھی اس کے لہجے میں؟

جیسے۔۔۔۔۔ میٹھا سا پیار

جیسے۔۔۔۔۔ پیار بھری التجا

جیسے۔۔۔۔۔ اک انتظار

جیسے۔۔۔۔۔ ایک حسرت

وہ پریشان ہو کر ٹھلنے لگی۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس وقت وہ اچانک ہی اسے بلا لے گا وہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر اسے لگا اگر وہ نہ گئی تو فیضان بہت ہرٹ ہوگا۔ نہ جانے کیوں وہ اس کے سامنے جانے سے گھبرا رہی تھی۔ وہ کچی عمر کی کنواری لڑکی نہیں تھی پھر بھی وہ اس کی والہانہ نظروں اور گفتگو سے خائف تھی۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب میں کسی کو بھی اپنی زندگی میں آنے نہیں دوں گی۔ اب مجھ میں اور دھوکے کھانے کی سکت کہاں ہے؟ پھر ہرٹ ہوں گی۔۔۔ پھر سے اعتماد ٹوٹے گا۔۔۔ پھر سے کھونے کا ڈر ہوگا۔۔۔ کیوں یہ شخص میری ٹھہری ہوئی زندگی میں ہلچل مچانے کی کوشش کر رہا ہے؟ وہ پھر سے پٹنگ کے کنارے بیٹھ گئی کمرے میں بے پناہ خاموشی تھی جیسے گھڑی کی ”ٹیک ٹیک“ کا اتعارش توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ایسے لگا کہ اس وقت فیضان بھی بے چین ہوگا۔ وہ آس و نراس کے دورا ہے پر کھڑا ہوگا۔

پھر وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اپنے چہرے اور حلیے کا جائزہ لینے لگی کہ دس سال پہلے والی اسٹائلش ہیئر کٹ اور ڈریسنگ والی رائٹل کی ہلکی سی جھلک آئینے میں دکھائی نہ دی۔ اس کے چہرے پر اس پر بیٹے دنوں نے گہری اداسی اور گزرے وقت کے گہرے نقوش چھوڑ دیئے تھے۔ وہ پھر اپنے وارڈروب کی طرف ہلٹی اور ایک ہلکا گلابی جوڑا نکالا اور اس کا جائزہ لینے لگی پھر مطمئن نہ ہو کر اسے بیڈ پر چھوڑا اور سفید پر ہنگ والا خوبصورت جوڑا نکالا اور اسے بھی بیڈ پر چھوڑا۔۔۔ پھر ہر اجوڑا۔۔۔ پھر نیوی بلیوسوٹ۔۔۔ کون سا جوڑا پہن کر جاؤں؟ یہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ وہ والا۔۔۔ کہ اچانک اس کی نظر پھر آئینے پر پڑی۔ اس کے بال بے ترتیبی سے اس کی پیشانی اور گردن پر آگئے تھے اور چہرے پر وحشت سی چھائی ہوئی تھی۔۔۔ یہ دیکھ کر اس کا سارا جوش ہی ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ سوچنے لگی۔۔۔

یہ اس عمر میں پھر مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا خوبصورت لباس میری ٹوٹی ہوئی شخصیت کو پھر سے نکھار پائے گا؟ کیا میرے چہرے کی وحشت کو چھاپائے گا؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے نہیں جانا۔۔۔

اور۔۔۔ کیوں جاؤں؟

کون ہے وہ میرا۔۔۔؟

اس کی پرواہ کیوں کروں آخری؟

اس نے تمام جوڑے واپس وارڈروب میں ہنگ کئے اور پھر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر ہنگ کے کنارے بیٹھ گئی کچھ دیر ایسے ہی گزر گئی پھر جیسے کوئی فیصلہ کیا اور اٹھی اور بابا پیر کو ڈرائیور کو فیضان صاحب



سے کارڈ لے آنے کا کہا اور اس ہو کر پلنگ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ وہ نجانے کتنی دیر اسی حالت میں رہی کہ پاس پڑے ہوئے موبائل کی رنگ ٹون پر چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ سیل فون اٹھا کر دیکھا تو فیضان کا نام جل بجھ رہا تھا۔ وہ ایک دم نروس ہوئی اور جب کال ریسپونڈ کی تو اسے فیضان کی بوجھل آواز سنائی دی تو اس نے گھبرا کر خود ہی کہا۔

”فیضان صاحب! میں نے ڈرائیور کو آپ کے پاس روانہ کیا ہے وہ آتا ہی ہوگا۔“

”جی ہاں! وہ مجھ سے ابھی ابھی کارڈ لے کر گیا ہے۔“ وہ بہت دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”میں اتنی دیر تک آفس میں فقط اس آس پر بیٹھا تھا کہ آپ خود آئیں گی۔ کیا کیا جائے کہ آپ پر میری کسی بھی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ اب کچھ اور کہنا بھی فضول ہی ہے۔ اب میں گھر جا رہا ہوں۔ بس ایک نوازش کیجئے گا کہ براہ کرم پروگرام میں ضرور آئیے گا۔ ایسا نہ ہو کہ اس میں بھی نہیں آئیں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ میں ضرور آؤں گی۔“

وہ گھبرا کر بولی تو اس نے اس سے الوداعی کلمات کہہ کر کال ڈسکونیکٹ کر دی تو اس نے جیسے سکون کا سانس لیا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس وقت فیضان کو دکھ دے کر وہ خود بھی دکھی ہو گئی تھی۔ پھر خود سے کہنے لگی۔

”کیا کروں میں؟۔۔۔ کیسے سمجھاؤں اسے کہ جتنا وقت اس نے انتظار اور بے چینی میں کاٹا تھا وہ اذیت وہ اپنے اندر پل پل محسوس کر رہی تھی۔۔۔ مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔۔۔ اسے کیا دے سکتی ہوں؟ میں تو خود کرچی کرچی ہوں۔۔۔“

☆.....☆.....☆

”مس زارا! تھوڑا سا ٹائم نکال کر اسٹیج کی سیٹنگ آ کر دیکھ لیں۔ کوئی تبدیلی کرانا چاہیں تو بتادیں۔“

”جی فواد صاحب! میں خود بھی آ ہی رہی تھی دیکھنے کے لئے۔“

زارا آرٹ سرکل کے آڈیٹوریم میں پہنچی تو دیکھا کہ فواد ٹیکنیکل لوگوں کے ساتھ کھڑا اسٹیج کے بیک گراؤنڈ میں پینا فلیکس پوسٹر لگوا رہا تھا۔ وہ فل بیک اسٹیج پوسٹر کو دیکھ کر چونک پڑی۔ زارا کی تصویر کو ڈیجیٹل پینٹنگ میں بنایا گیا تھا۔ ہال میں آتے ہی اس کے خوبصورت ڈیجیٹل پورٹریٹ اور ساتھ میں کتاب کے ٹائٹل کی تصویر تھی۔

”بہت خوبصورت ہے پوسٹر۔“ زارا بے اختیار بولی۔

”اور میرا بتایا ہوا ڈیجیٹل پورٹریٹ کیسا لگا؟“ فواد نے پوچھا۔

”بہت ہی خوبصورت جب کہ حقیقت میں، میں اتنی خوبصورت نہیں ہوں۔ میں نے پوسٹر کے لئے جو فوٹو گراف آپ کو بھیجا تھا اس کی ڈیجیٹل پینٹنگ ہے مگر وہ فوٹو تو اتنا خوبصورت نہیں ہے۔ خیر۔۔۔ تو آپ نے میرا پورٹریٹ بنایا لیا۔“

زارا مسکرا کر بولی آج شام رونمائی تھی اس لئے وہ ہال کا بھرپور جائزہ لینے لگی۔ اتنی دیر میں حسین بھی پہنچ گیا۔ زارا نے اصرار کر کے اسے بلایا تھا۔ وہ اسٹیج کے بیک پر لگے پورٹریٹ کو دیکھنے لگا۔

”آخاہ!۔۔۔۔۔ یہ تو اپنے حسین سید ہیں ناں؟ یہ بھی ہماری آرٹ اینڈ لٹری سوسائٹی کے ممبر تھے۔“

فواد نے حسین کو دیکھا تو کہا اور بڑھ کر اس سے گرجوٹی سے ہاتھ ملایا۔ حسین نے بھی مسکرا کر ہیلو ہائے کی اور اس کے پوسٹر کی تعریف کی۔

”لگتا ہے کہ قدرت ہم سب کو پھر اکٹھا کر رہی ہے۔ آپ لوگوں کو راتیل تو یاد ہوگی میری کلاس فیلو اور

ہماری لٹری سوسائٹی کی آرٹ کے شعبے کی سرگرم رکن۔ ڈسپلے ہال میں آج ان کی پینٹنگز کی بھی نمائش ہے۔“

ابھی فواد نے یہ کہا بھی تھا کہ شاہد بھی پہنچ گیا۔ وہ کتاب کی کاپیاں لے کر آیا تھا۔ وہ بھی فواد سے مل کر خوش ہوا پھر چاروں مل کر ڈسپلے ہال میں گئے وہاں راتیل سے بھی ملاقات ہوئی اور اس کی پینٹنگز بھی دیکھیں۔ زارا کو راتیل بہت پیاری لگتی تھی۔ سلم، اسمارت، شولڈر تک اسٹائش، میٹرکنگ میں راتیل کو بھی زارا اچھی لگتی تھی۔

”آپ کو آج آنا ہے میری کتاب کی رونمائی میں۔“

”تھوڑی دیر کے لئے ضرور آؤں گی کیونکہ میری پینٹنگز کا ڈسپلے بھی چل رہا ہے اس لئے مجھے یہاں رہنا ہے۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔

پینٹنگز دیکھنے کے بعد وہ ہال سے نکلے۔

☆.....☆.....☆

جنوری کی وہ خوبصورت خنک شام راتیل کی دنیا میں نئی تبدیلی لے کر آئی تھی۔ آج بہت عرصے کے بعد وہ

ٹھیک طرح سے تیار ہوئی تھی اور اپنا پسندیدہ نیوی بلیسوٹ پہن کر ہلکا سا میک اپ کیا اور فیضان کا پروگرام اٹینڈ کرنے کے لئے روانہ ہوئی اور جیسے ہی وہاں پہنچ کر اس نے مین گیٹ پار کیا تو دیکھا کہ سامنے ہی وہ کچھ مہمانوں کے ساتھ لان میں مجو گفتگو تھا مگر جونہی اس کی نظر رائیل پر پڑی تھی، وہ ایک دم والہانہ انداز میں اس کا استقبال کرنے کے لئے بڑھا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کے فل سوٹ میں ملبوس تھا اور بہت ہینڈ سم لگ رہا تھا۔ وہ اسے لے کر آڈیٹوریم میں آیا اور اسے بہت عزت و احترام سے اگلی قطار کی ایک نشست پر بٹھایا اور وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔

رائیل بہت عرصے کے بعد کسی بڑی گید رنگ میں آئی تھی۔ وہ ہال میں بیٹھے مہمانوں کا جائزہ لینے لگی تو اس کی نظریں بار بار ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر آ کر ٹھہر جاتیں تھیں جن کے شانوں پر فیضان کے بنائے ہوئے فورم ”مشعل“ کے مختلف عہدوں کے بیجز لگے ہوئے تھے۔ اور وہ اسٹیج کے اور پروگرام کے مختلف انتظامات میں مصروف تھے، ان کے چہرے کتنے روشن اور پر جوش تھے۔ جب کمپیئر نے فیضان کو اسٹیج پر بلایا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ فیضان نے اپنی گیمبر آواز میں تقریر شروع کیا اور مختصراً ”مشعل“ کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ رائیل تو اسے بس دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ اسٹیج پر پڑتی مختلف رنگوں کی روشنیوں کے عکس کے درمیان کھڑا وہ کتنا شاندار لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت اور گفتگو میں ایک سحر تھا سارا ہال خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔ اور جب اس نے تقدیر تمام کی تو ایک بار پھر سے سارا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ اس کے بعد ”مشعل“ کے مختلف عہدیداروں نے بھی آ کر فورم کے مختلف پراجیکٹس پر روشنی ڈالی تو اسے احساس ہوا کہ اتنے دنوں سے جسے وہ اتنا عام طریقے سے ڈیل کر رہی تھی وہ تو بہت خاص انسان نکلا تھا اور اس نے اس کا روکھا رویہ اور کڑوی باتیں برداشت کی تھیں۔

میگزین کے پہلے شمارے کی رونمائی کے بعد ایک نوجوان اور لڑکی بہت پرکشش سانولے چہرے تھکے نقوش لئے اسٹیج پر آئی۔ اس کا نام نیشا تھا۔ بے حد اسمارٹ لڑکی تھی۔ ساڑھی پر شانوں تک اسٹاکش ہیئر کٹ کے ساتھ وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ مگر وہ صرف حسین نہیں تھی بلکہ ذہانت بھی تھی۔ اس نے بڑے اعتماد سے پروجیکٹر پر لیپ ٹاپ کی مدد سے اپنی پریزینٹیشن دی۔ ڈاکیومنٹری میں تھر کے علاقے میں خشک سالی اور قحط کی

حشر سامانیاں دکھائی گئی تھیں اور بتایا گیا کہ جب کہ دنیا ”گلوبل ولج“ میں بدل رہی ہے اس دور میں بھی ہم وہاں تک پانی کی سہولت نہ پہنچا سکے جب دوسری طرف سیلابی پانی کو کنٹرول نہیں کر سکتے اور وہ بستیاں اجاڑتا ہوا ضائع ہو جاتا ہے۔ وہ کسی اور جگہ کی فلم نہیں تھی مگر ہمارے اپنے لوگ دکھائی دیئے کہیں بھوک سے بلک کر مرتے ہوئے بچے تھے تو کہیں پانی میں ڈوبے ہوئے بے یار و مددگار غریب لوگ تھے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کے گھناؤنے واقعات کی تفصیلات سن کر اور ان کی آہ و زاری دیکھ کر رائیل تو سر سے چیر تک کانپ گئی۔ پھر ہپتالوں میں لاوارثوں کی طرح پڑے مریضوں کی آہ و بکا تھی تو دوسری جانب جیلوں میں بند بے گناہ لوگوں کی درد بھری داستانیں تھیں۔ اس سے پہلے اس نے جتنے پروگرام اینیڈ کئے تھے ان میں فقط تقریریں ہوتیں مگر یہاں باقاعدہ ریسرچ ورک تھا۔ اور ٹھوس حقائق بیان کئے گئے تھے۔

اس کے بعد فوک میڈیک کو جدید آلات اور سازوں پر پیش کیا گیا تو ماحول ہی بدل گیا۔ نو جوانوں کے بینڈ کی طرف سے شاہ لطیف، بابا بلھے شاہ، اقبال اور فیض احمد فیض کے گیت جدید بیٹ پر کمپوز کر کے سنائے گئے تو سب ہی جموم اٹھے تھے اور ہال سے نو جوان اٹھ اٹھ کر اسٹیج پر اور اسٹیج کے قریب ناچنے لگے تھے۔ رائیل کو ایسے لگا کہ یکا یک وہ کسی اندھے کنویں سے نکل کر روشنی میں آکھڑی ہو۔ کیا وہ واقعی اس کا ئی زدہ سماج میں تھی یا پھر ایک بہتے ہوئے دریا کے شفاف پانی کے کنارے کھڑی تھی؟ وقت اور حالات بدل چکے ہیں۔ بہت کچھ تبدیلی ہو چکا ہے اور تبدیلی کا یہ عمل جاری و ساری ہے اور رہے گا کہ یہ قانون قدرت بھی ہے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ ابھی اتنا کچھ نہیں بدلا ہوگا اس معاشرے میں یہ نو جوان نئی منزلوں کے راہی ضرور ہیں مگر کیا کچھ ذہن روشن ہونے سے تبدیلی آئے گی؟۔۔۔ اس کے ذہن میں پھر سے متنی خیالات آنے لگے۔

رنگارنگ پروگرام کا اختتام ”ہو جمالو“ پر ہوا اب تو لڑکیاں بھی اسٹیج پر چڑھ کر تالیاں بجا رہی تھیں اور لڑکے ”ہو جمالو“ کے روایتی طرز پر ناچ رہے تھے اور فل سوئوں پر گلے میں رنگارنگ اجرکیں ڈالے کچھ انگریزی اسٹائل میں ناچ رہے تھے تو کچھ سندھی اسٹائل میں یہاں تک کے کچھ بھنگڑا ڈانس کر رہے تھے جس پر ہال میں قہقہے گونج رہے تھے۔ رائیل نے بھی اتنے عرصے کے بعد انجوائے کیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب تک ہمارے نو جوان اپنی زبانوں اور ثقافت سے پیار کرتے رہیں گے تب تک نہ تو کوئی ہماری زبانوں کو مٹا سکتا ہے نہ



ہی کچھ کو۔ بلکہ یہ نوجوان تو نیٹ اور جدید ذرائع سے ان کی ترویج کریں گے۔ اچانک اس کی نظر فیضان پر پڑی جو کچھ فاصلے پر کھڑا اسے مسکراتے اور انجوائے کرتے ہوئے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار مسکرائی تو اس نے شکریہ ادا کرنے کے اسٹائل میں اپنا سر خم کیا تھا۔

اس کے بعد پینٹنگز کی نمائش کا افتتاح تھا۔ سب لوگ بڑے ہال میں جمع ہوئے۔ تمام فنکاروں کے کام کو سراہا جا رہا تھا مگر رائیل کی منفرد Paintings نے تو سب کو جکڑ لیا تھا۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس سے آٹوگراف لینے لگے۔ اتنے عرصے کے بعد میڈیا کے نمائندوں نے رائیل کو وہاں پایا تو گھیر لیا۔ پھر کیمروں کے فلیش روشنیوں اور رپورٹروں کے سوالات نے اسے پریشان کر ڈالا تھا اور اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی اس لئے ایک مرتبہ وہ موقع پاتے ہی چپکے سے ہال سے نکل آئی تھی۔ اتنے میں فیضان نے اسے دیکھا تو ریفریشمنٹ ہال کی طرف لے آیا۔ وہ کچھ بھی کھانہ سکی بس کافی کاگ لیا اور کونے میں کھڑی ہو کر سپ لینے لگی۔ اب وہ گھر جانا چاہتی تھی۔ فیضان کی طرف دیکھا تو وہ اپنے فیرملکی مہمانوں میں گھبرا کھڑا تھا لہذا اسے الوداع کہے بغیر وہ خاموشی سے گھر چلی آئی تھی۔ قدم گھر میں رکھتے ہی اسے ایسا لگا تھا کہ وہ ایک مضبوط قلعے میں آگئی ہو جہاں وہ محفوظ ہوگئی ہو۔ اب وہ بھیڑ بھاڑ سے بہت گھبراتی تھی۔ وہ تو بالکل آدم بیزار بن چکی تھی۔ چیخ کرنے کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ موبائل گنگنا اٹھا۔ دیکھا تو پتہ چلا کہ فیضان کی کال آ رہی تھی۔

”ہیلو! وہ بولی

”رائیل صاحبہ! آپ بتاتے چلی گئیں۔ آپ نے شاید ریفریشمنٹ بھی نہیں لی۔“

”سوری فیضان صاحب! مائنڈ مت کیجئے گا۔ بس مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی اتنی بھیڑ میں اس لئے چلی آئی۔“

”کمال کرتی ہیں آپ بھی۔۔۔“ وہ اپنی جون میں بولتا رہا۔

”آپ اتنے سالوں کے بعد فن کی دنیا میں واپس آئی ہیں۔ لوگوں کو آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے اور میڈیا کے نمائندے آپ کا انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔“

”فیضان صاحب! اب میں فوکس (focus) میں آنا نہیں چاہتی۔ مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ میں

شاید ڈھنگ سے ان کے سوالوں کے جواب نہیں دے پاتی۔ میں تو صرف آپ کا دل رکھنے کی غرض سے وہاں آئی تھی ورنہ میں تو اب کہیں بھی نہیں جاتی۔“

”یہ نمائش تو ہفتہ بھر جاری رہے گی۔ تو کیا آپ روز نہیں آئیں گی یہاں۔ باقی آرٹسٹ تو آئیں گے۔ تاکہ لوگ آپ لوگوں سے مل سکیں بات کر سکیں۔“

”نہیں۔۔۔ میں نہیں آ پاؤں گی۔ میری طرف سے معذرت قبول فرمائیں۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ وہ دھندلائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اچھا یہ تو بتائیں کہ آپ کو پروگرام کیسا لگا؟“

”بہت ہی اچھا تھا۔ اتنے خوبصورت پروگرام کو اربج کرنے کے لئے میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔ بہت ہی مختلف تھا اور آج مجھے احساس ہوا کہ آپ کوئی عام آدمی نہیں ہیں۔“

”Thanks۔ میرے لئے آپ کے یہ کمنٹس بہت ہی اہم ہیں۔“

”ویکم!“

”رائیل صاحبہ! اگر اجازت ہو تو ایک بات کہوں؟“

”جی۔۔۔ کہیے۔“

”کیا میں آپ سے موبائل پر رابطہ رکھ سکتا ہوں؟“

”مگر۔۔ کیوں؟“ وہ حیران ہو کر بولی۔

”اگر میری صاف گوئی پر ناراض نہ ہوں تو کہوں۔۔۔“

”کہیے۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔“

”آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اس لئے رابطہ رکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ کسی معصوم بچے کی طرح کہہ گیا تو اس کے چہرے پر ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ کوئی بیک ورڈ خاتون نہیں تھی اس لئے اس نے بھی صاف گوئی سے کہا۔

”اچھے تو آپ بھی لگے ہیں مجھے کیونکہ آپ میں ایسی بہت ساری خوبیاں ہیں جو ہمارے ہاں بہت کم لوگوں

میں ہوتی ہیں آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور با اعتماد ہیں آپ کو بات کرنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے۔ آپ بہت ٹیلنٹڈ بھی ہیں اور اپنی ان تمام خوبیوں کو مثبت سرگرمیوں میں استعمال کرنا چاہتے ہیں نہ کہ منفی سرگرمیوں میں اس لئے مجھے آپ سے مل کر واقعی اچھا لگا۔“

”جھینکس! پھر۔۔۔ بات کر سکتا ہوں ناں آپ سے؟“

”ٹھیک ہے۔ مگر کبھی کبھار۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ جھینکس۔۔۔۔۔ اچھا اب اجازت اپنا خیال رکھئے گا۔“

”آپ بھی۔۔۔۔۔“ رائیل کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا اور پھر وہ جھینپ گئی۔ کال ڈس کنیکٹ کر کے وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔

آج کتنے عرصے بعد اسے اپنے اندر کسی خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ آج اس نے سب گھروالوں سے باتیں کیں۔ بابا پیرو، پھپھو سے، گلاں اور شفن سے بھی اور رات کے کھانے میں گلاں کی مدد بھی کی۔ سردیوں کی سردرات میں جب رات کا کھانا کھا کر وہ بہت عرصے کے بعد پھپھو کے کمرے میں ان کے پلنگ پر، رضائی میں دبک کر کتنی ہی باتیں کیں۔ ان سے اپنے بچپن اور امی، ابو کے متعلق بہت سی باتیں سن کر وہ ماضی کے خوبصورت دنوں میں کھوی گئی۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر دیر تک کافی چتی، کتاب پڑھتی اور خیالوں میں خوبصورت یادیں لئے وہ جاگتی رہی کیونکہ دوسرے دن سنڈے تھا۔ چھٹی تھی۔

پھر یکا یک یہ سوچ کر اسے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا کہ فیضان اپنے مہمانوں کے ساتھ بہت مصروف تھا پھر بھی اس نے نوٹ کر لیا تھا کہ وہ ریفر۔ شمنٹ کئے بغیر وہاں سے آگئی تھی۔۔۔۔۔ حالانکہ بظاہر تو وہ اس سے لا پرواہ نظر آ رہا تھا۔۔۔۔۔ ایسا کیا تھا اس میں کہ فیضان اسے اہمیت دے رہا تھا۔۔۔۔۔ کتنے عرصے بعد رائیل کو پھر لگا کہ وہ اہم ہے۔ اور یہ احساس کتنا خوبصورت تھا اس کے لئے۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

کتاب کی رونمائی کے لئے سب انتظار کر رہے تھے۔ سارا ہال بھر چکا تھا میڈیا کے نمائندے بھی آچکے تھے مگر زارا بہت پریشان تھی کیونکہ حسین نہیں پہنچا تھا وہ بار بار اسے کال کر رہی تھی مگر وہ ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا۔ اتنے

میں پروگرام کی کمپنر نے پروگرام شروع کرنے کا اعلان کیا اور باری باری مہمان خصوصی اور سنئیر ادیب خواتین و حضرات کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی اور زارا کو بھی بلایا۔

تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر موجود سنئیر ادیبوں نے پھولوں کے ڈھیر پر ٹیبل پر بھی کتابوں کی کاپیاں اٹھائیں اور Audience کی طرف رخ کر کے کتاب کے ٹائٹل کو دکھایا تو اسٹیج کی چھت کی طرف سے پھولوں کی پٹکھڑیوں کی مانند چمکتے ہوئے کاغذوں کے ذرات کی ہلکی سی برسات ہونے لگی اور اسٹیج پر رنگین لائٹس کے شیڈز میں چمکتے گرتے، وہ خوابناک منظر کی طرح دکھ رہے تھے۔ زارا کو خود پتہ نہیں تھا کہ فواد نے یہ اہتمام بھی کیا تھا۔ میڈیا کے لوگ اسٹیج کے آگے جمع ہو کر اس منظر کو ویڈیو میں بھر رہے تھے۔ تب وہیں اسٹیج پر سے اس نے دیکھا کہ شاہد ہال کی آخری دیوار سے ٹیک لگا کر مسکرا کر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ زارا کو دکھ ہوا کہ کتاب چھپوانے کی ساری محنت اور دوڑ دھوپ اس کی تھی مگر وہ پس منظر میں رہتا چاہتا تھا۔

اب پروگرام شروع ہوا اور نامور ادیب زارا کی کتاب کے بارے میں رائے دے رہے تھے۔ اسی دوران حسین آیا تھا اور دوسری قطار میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ پروگرام ابھی جاری ہی تھا کہ وہ درمیان سے اٹھ کر چلا گیا۔ پروگرام ختم ہوا تو لوگوں کو ریفر-شمنٹ کے لئے باہر لان میں بلایا گیا۔ میڈیا کے نمائندوں نے زارا کو ہال میں ہی گھیر لیا۔ وہ دروازے کے قریب ان کے سوالات کے جوابات دے رہی تھی کہ ہال سے باہر ایک نیم اندھیرے سے کونے میں فواد اکیلا بیٹھا دیکھا۔ وہ ٹھنکی باندھے اسے اسی دن کی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ادا سی تھی۔

پروگرام بہت کامیاب رہا۔ رات دس بجے کے قریب وہ گھر پہنچی۔ جب رات دیر میں وہ اپنے کمرے میں سونے کے لئے لیٹی تو ہال کی آخری دیوار سے ٹیک لگائے شاہد کے کھڑے ہونے اور نیم اندھیرے میں اکیلے بیٹھے فواد والے منظر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے اور وہ سوچنے لگی کہ جن دو لوگوں کی وجہ سے آج کا پروگرام کامیاب رہا وہ تو سامنے بھی نہیں آئے جب کہ حسین کا کام تھا کہ وہ اس کے لئے کام کرتا۔ عجیب گورکھ دھندہ تھا یہ ذات پات اور کلاس کی اونچ نیچ جس کی وجہ سے وہ حسین کو فوقیت دیتی تھی اور سالوں سے انتظار کی سولی پر لٹکی ہوئی تھی ورنہ محبت کو اظہار کی بھی ضرورت نہیں تھی وہ آج شاہد اور فواد کی خاموش محبت دیکھ چکی تھی مگر وہ



دکھی تھی ان کی یکطرفہ محبت پر۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

رائیل کی زندگی میں ایک ہلکی سی خوشگواریت آگئی تھی۔ اس کا موڈ پہلے کی طرح روکھا اور اداس نہیں رہتا تھا مگر بہتر رہنے لگا۔ یونیورسٹی میں بھی اسے حرا آنے لگا اور اب تو وہ پچھو سے بھی بات چیت کر لیتی تھی۔ وہ اس کی اس تبدیلی پر بہت خوش تھیں اور کچھ حیران بھی انہی دنوں ایک شام فیضان کی کال آئی تھی۔

”فیضان صاحب! نمائش کیسی جا رہی ہے؟“

”بہت شاندار جا رہی ہے سارا سارا دن لوگ آرہے ہیں اور آرٹسٹوں کو خوب داد مل رہی ہے۔“

”اچھا۔“ وہ اتنا ہی بول پائی۔

”مس رائیل!“

”جی؟“

”کبھی کبھار آپ بھی کال کر لیا کریں۔۔۔ اپنی نازک انگلیوں کو تھوڑی سی زحمت دے دیا کریں۔۔۔ دیکھیں

ناں۔۔۔ اب ون وے ٹریفک اچھی تو نہیں لگتی ناں۔۔۔۔۔“ وہ پتہ نہیں کس جون میں بولے گیا تو رائیل نے پرانے روکھے انداز میں کہا۔۔۔

”آپ خود ہی ون وے سڑک پر آئے ہیں میں نہیں لائی تھی آپ کو۔ میں نے تو آپ کو بھی کال کرنے کی

اجازت اس لئے دی ہے کہ یہ آپ کی خواہش ہے، میری نہیں۔ میں نے کبھی کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا۔“

”مگر۔۔۔ آپ نے کہا تھا کہ میں آپ کو اچھا لگا ہوں۔“

”جی ہاں! اور میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں ایسے تو ہمیں کئی لوگ اچھے لگتے ہیں ہمارے کلاس فیلوز،

کولیگز، ادیب، شاعر، کرکٹرز اور فنکار وغیرہ۔۔۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہم روزانہ ان سے فون پر

بات کریں۔“

”آپ درست فرما رہی ہیں۔ لیکن اگر ہم ان سے ہٹ کر کوئی تعلق بنائیں تو۔۔۔۔۔“

”آخر کو مر رہی ہیں ناں!۔۔۔۔۔“ اس نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔

”ہم جیسی عورتوں کی بھی تو سب سے بڑی بد نصیبی ہے کہ ابھی ہم ایک قدم آگے بڑھاتی ہی ہیں کہ مرد گدھوں کی طرح منڈلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر کوئی ”دوستی“ اور ”پیار“ کے دھوکے کا جال ہاتھوں میں لئے کھڑا ہوتا ہے، باقی عزت دینے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔“

”رائیل صاحبہ! میں ہرگز ایسے مردوں میں سے نہیں ہوں۔ آپ میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہیں۔ آخر آپ اتنی شکی مزاج اور بدگمان کیوں ہو گئیں ہیں کہ آپ اچھے اور برے انسان میں تمیز بھی نہیں کر سکتیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ اگر کوئی اچھا انسان ملے تو اس کے خلوص کو مت ٹھکرایئے گا۔ اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں نے آپ کا وقت برباد کیا ہے تو میں سوری کرتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے کال ڈسکلیٹ کر دی۔ رائیل بہت شرمندہ ہوئی اور سوچا کہ یہ اس نے کیا کیا؟ کیا برائی کی تھی اس نے؟ نمائش کے سلسلے میں بھی اس نے اسے کتنا تنگ کیا تھا اور تعاون کر کے نہیں دیا مگر وہ پھر بھی بہت صبر اور بردباری سے اس کا رویہ برداشت کرتا رہا تھا اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا تھا۔۔۔ مگر وہ پھر بھی اسے بار بار ہرٹ کر دیتی ہے۔ آخر کیا ہو گیا ہے اسے۔ سب لوگ اس کے رویے سے شاکر رہتے ہیں اور سب اس سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور وہ ہرگز رتے دن کے ساتھ اپنی ذات میں تنہا ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پھر سے چپ چپ رہنے لگی۔ فیضان کی کال دوبارہ آئی تھی۔ اب کی بار اس کی آواز میں وہ پہلا سا جذبہ اور تازگی نہیں تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”آج نمائش کا آخری دن ہے۔ آج رات آٹھ بجے کے بعد تمام بیننگز اتار دی جائیں گی۔ تمام آرٹسٹ اپنی اپنی تصاویر لے جائیں گے۔ آپ تو آئی نہیں اس لئے کسی کو بھیج کر اپنی Paintings منگوا لیجئے گا۔“

”تھینک یو فیضان صاحب! آئی ایم سوری کہ میں نے آپ کو بہت ٹھٹھا ٹم دیا۔ مگر آپ نے میرا قدم قدم پر بہت خیال رکھا۔“

”مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ میرے ساتھ لنچ یا ڈنر کریں۔“ وہ بے خودی میں بول گیا تو اس نے بھی دھیرے سے کہا۔۔

”آپ کا کوئی قصور نہیں ہے فیضان صاحب! آپ پانچ سالوں کے بعد امریکہ سے لوٹے ہیں اس لئے

وہاں کی ایڈوانس اور آزاد زندگی کو دیکھنے کے بعد آپ کی سوچ میں وسعت آگئی ہے مگر یہ ہمارا وطن ہے، ہمارا معاشرہ ہے اور اس شہر کا ماحول ابھی اتنا ایڈوانس نہیں ہوا ہے کہ میں آپ کے ساتھ بے فکری سے لےج یا ڈنر کر سکوں۔ دوسری بات یہ کہ میں ایک طلاق یافتہ عورت ہوں، اس لئے یہ میں ہی جانتی ہوں کہ مجھے ایک ایک قدم کتنا احتیاط سے اٹھانا پڑتا ہے جیسے کوئی کچھڑ میں چلتا ہو کہ مبادا اس کے چھینٹنے اس کے سفید لباس پر نہ لگ جائیں۔۔۔ اسی طرح بس۔۔۔ اپنی ساری زندگی ہی میں اپنے دامن کو غلیظ چھینٹوں سے بچاتی آئی ہوں کہ کوئی بھی اسکی نڈل میرے مستقبل کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہے۔۔۔ کیونکہ اس سوسائٹی میں اکیلی عورت کی زندگی بہت ہی دشوار ہوتی ہے۔۔۔ وہ اکیلی لوگوں سے لڑ نہیں سکتی۔۔۔ یہاں تو میں کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتی۔“

”سوری آگین!۔۔۔ میں ہمیشہ کوئی غلط فہمائش کر دیتا ہوں۔ آپ کسی کو بھیج کر اپنی Paintings منگوا لیجئے گا۔“

”او کے۔ تھینکس!“ رائیل بولی۔

رات کے آٹھ بجے تو وہ بہت بے چین ہو گئی وہ مسلسل فیضان سے اپنے رویے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے لگا کہ وہ اس کے رویے سے بہت ہرٹ ہو گیا تھا۔ اب بس یہی وقت رہ گیا تھا کہ وہ اس سے مل کر سوری کہہ سکے۔ یہ سوچتے ہی اس نے ڈرائیور کو کارنکالنے کا کہا اور تامل ہال کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب اس نے وسیع و عریض ہال میں قدم رکھا تو دیکھا کہ سب آرٹسٹ اپنی اپنی بینٹلز کو سنبھال رہے تھے۔ وہ اس کارنر کی طرف بڑھی جہاں اس کی اپنی Paintings لگی تھیں۔ اور وہ چونک پڑی کہ وہ وہاں کھڑا خود اپنے ہاتھوں سے ایک ایک تصویر کو احتیاط سے اتار رہا تھا۔ اس نے رائیل کو وہاں آتے نہیں دیکھا تھا اس لئے اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ آخر کار اسے متوجہ کرنے کے لئے وہ آہستہ سے کھنکری تو وہ حیران ہو کر اس کی طرف مڑا تھا اور پھر اس کی نظروں میں ایک عجیب سی چمک آئی اور ایک تاثر ابھرا جس کو وہ کوئی معنی نہیں دے پا رہی تھی۔۔۔ بس ایک بے خودی کا عالم تھا کہ وہ دونوں خاموش تھے مگر خاموشی کوئی کہانی سن رہی تھی آخر کار رائیل نے اس طلسم کو توڑا۔

”مجھے بہت خوشی ہوگی کہ آپ اپنی پسند سے ان میں سے کوئی Painting لیں جو میری طرف سے گفٹ

”ضرور۔۔۔ مگر۔۔۔ ایک شرط پر۔“ فیضان چبکا۔

”کون سی شرط؟“ وہ بولی۔

”کل کو اگر میں کوئی گفٹ دوں تو آپ لینے سے انکار نہیں کریں گی۔“

”منظور ہے؟“ وہ مسکرا کر بولی۔

”تو پھر میں یہ Painting لے رہا ہوں۔“ اس نے پت جھڑ کے خوبصورت منظر والی پینٹنگ لے کر کہا

”آپ کی تقریباً ہر تصویر بہت ادا اس ہے اور تنہائی کا تاثر لئے ہوئے ہے جب کہ آپ جیسے تخلیقی لوگوں

کو مایوسی پھیلانے کے بجائے لوگوں کو نئی امید کی نوید دینی چاہئے۔“

”ہم آرٹسٹ لوگ بے حد حساس ہوتے ہیں ہر بات کو انتہائی گہرائی سے محسوس کرتے ہیں اور یہ سوسائٹی جو

feelings ہمیں دیتی ہے وہی ہم Canvas پر ان کو لوٹا دیتے ہیں۔“

رائیل Paintings لے کر گھر آئی۔ اس رات دیر تک اس کے اندر ایک بے کلی سی تھی۔ رات کو بستر پر

لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کیونکہ آنکھیں بند کرتے ہی نظروں کے سامنے بار بار وہ منظر آ جاتا کہ

فیضان اس کی Paintings کو کتنی احتیاط سے اتار رہا تھا۔۔۔ آخر وہ بار بار اس کے متعلق کیوں سوچ رہی

ہے؟۔۔۔ یہ کیسی تبدیلی ہے اس کے اندر؟ یہ شخص تو اسکے دل و دماغ پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی تو وہ اسے بہت

چالاک اور عیار سمجھتی جو اسے صرف عورت کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور اسے اپنے لفظوں کے سحر میں جکڑنے کی

کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔ مگر پھر۔۔۔۔۔ دل نادان۔۔۔ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ پھر وہ اسے ایک

سچا اور کھرا انسان لگتا۔ آج وہ جس احتیاط اور پیار سے اس کی تصویروں کو سنبھال رہا تھا تو اسے لگا تھا کہ وہ صرف

اس کی تصویروں کو ہی نہیں مگر اس کے نازک جذبات کی حفاظت کر رہا تھا۔

اس کا ذہن ماضی کی طرف پلٹا۔ شادی سے پہلے اس کی خواہش تھی کہ اسے ایسا جیون ساتھی ملے جو ہر قدم پر

اس کو تحفظ کا احساس دے اور وہ اس کی محبت کی چھاؤں میں اعتماد سے اپنے فن کے سفر میں آگے بڑھتی

رہے۔۔۔ وہ اس کی شاہکار تخلیقوں کی نمائش میں اس کے ساتھ ساتھ رہے۔ اس کی کامیابیوں پر خوش ہو اور



اس کی شخصیت پر فخر کرے۔۔۔۔۔ مگر آصف۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔ بالکل اس کے الٹ تھا۔۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔ شادی شدہ زندگی کے دو تلخ سالوں کے بعد وہ اتنا ٹوٹ گئی کہ اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا اور خود کو گمنامی کی تہوں میں چھپا لیا تھا۔۔۔۔۔ لوگ بھی اسے بھول ہی گئے تھے کہ اچانک۔۔۔۔۔ فیضان اس کی زندگی میں داخل ہوا جس نے ایک جھٹکے سے ان تہوں کو اس کے اوپر سے اتار پھینکا تھا۔۔۔۔۔ اس طرح کہ وہ بری طرح سے گھبرا اٹھی تھی۔۔۔۔۔ جب رات دیر تک نیند نہ آئی تو اس نے ٹیبل کی سائیڈ پر رکھی سکون کی ٹیبلٹ لی اور پھر پہلو بدل کر سو گئی۔

☆.....☆.....☆

کتاب کے آنے کے بعد زارا کی حیثیت ادب کی دنیا میں اور مستحکم ہو گئی۔ اخباروں میں رومنائی کی خبریں تھیں۔ اس کے انٹرویو، کتاب پر تبصرے وغیرہ چھپ رہے تھے۔ یہ ابھی سوشل میڈیا کی مقبولیت کا دور نہیں تھا ورنہ وہاں بھی بہت چرچا ہوتا۔ پتا نہیں یہ زارا کا وہم تھا کہ حقیقت کہ اسے لگا کہ حسین اس کی اتنی میڈیا میں آؤ بھگت دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے زارا سے کہا۔

”مجھے قطعی پسند نہیں ہے یہ جو شاہد تمہارے آگے پیچھے پھرتا ہے لوگ باتیں بناتے ہیں۔“

”کیا باتیں بناتے ہیں؟“ وہ غصے میں پھٹ پڑی۔

”یہ۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ وہ تمہاری کتاب چھاپنے کے لئے اور پھر رومنائی کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کیوں کر رہا تھا۔“

یہ سن کر زارا کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور برسوں سے اس کے اندر بھرے ہوئے گلے شکوے باہر آنے کو تھے کہ اس نے اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے بہت ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

”بالکل ٹھیک باتیں کرتے ہیں لوگ۔۔۔۔۔ کیونکہ یہ کام اسے نہیں بلکہ تمہیں کرنے چاہئیں تھے مجھے لوگوں کی باتیں بنانے کی پرواہ نہیں ہے مگر تمہارے منہ سے یہ سن کر اچھا نہیں لگا۔ کہ لوگ تو۔۔۔۔۔ بلکہ ہم لوگ تو برسوں پرانے دوست ہیں۔ کیا تم اسے نہیں جانتے یا مجھے نہیں جانتے؟“

”تھوڑا انتظار کرو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“

”بس ا۔۔۔۔۔ بہت انتظار کر لیا۔ اب نہیں۔ تم نے کیا ہی کیا ہے میرے لئے؟ ارے محبت کا دم بھرنے والے تو بڑے بڑے قدم اٹھا لیتے ہیں تم نہ تو ماں کو منا سکے نہ ہی خود فیصلہ کن قدم اٹھا سکے۔ تم کون ہوتے ہو مجھے

یہ کہنے والے کہ کس کو میرے کام کرنے چاہئے کس کو نہیں؟ کس حیثیت سے تم نے اتنی بڑی بات کہی۔ کیا تعارف کرواؤں میں تمہارا لوگوں سے؟“

”زارا۔۔۔! پلیز۔۔۔ مجھے سودن کا وقت دو۔۔۔ میں سودنوں کے اندر کوئی فیصلہ کر لوں گا۔“

”تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں۔ یا تو اپنی امی کی مرضی سے شادی کر کے مجھے چھوڑ دیا پھر مجھ سے شادی کرنے کے لئے والدین کو چھوڑ دو۔ میں تو برسوں سے صرف ان دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا انتظار ہی کر رہی ہوں۔ میں نے تو تم پر کوئی دباؤ بھی نہیں ڈالا۔ پیار کا دعویٰ بھی تمہارا ہے میں نے تو بغیر کسی دعوے کے صرف تمہارا انتظار کیا ہے۔“

”زارا پلیز۔۔۔ صرف سودن۔۔۔“

”اوکے۔“



کچھ عرصہ گزر گیا فیضان نے پھر اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ تو۔۔۔ پھر۔۔۔ بھی ہر وقت وہ اس کی باتیں یاد کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے مختصر وقت کے مناظر بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے تھے۔ اسے پھر سے اس قدر بے چینی محسوس ہوتی تھی کہ وہ نماز پڑھ کر بارگاہ الہی میں ہاتھ اٹھا کر التجا کرتی۔۔۔

”پروردگار! اس شخص کو کسی بھی طرح مجھ سے دور کر دے۔ میں اپنے رویے سے اسے دکھ دینا نہیں چاہتی بس۔۔۔ کوئی ایسا راستہ نکلے کہ وہ مجھے یاد نہ کرے۔ اب میری زندگی میں کسی کے لئے بھی گنجائش نہیں ہے نہ ہی تمنا۔ میں پہلے ہی بہت دکھی ہوں۔۔۔ ٹوٹ چکی ہوں۔ اب کوئی نیا حادثہ اور کرب میں جھیل نہیں پاؤں گی۔۔۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔“

مگر کہا جاتا ہے کہ بندے کے من میں کچھ ہوتا ہے اور رب کے من میں کچھ اور عید الضحیٰ کے دوسرے دن شام کو اس کی کال پھر آئی وہی انداز لئے وہ بولتا رہا۔۔۔

”سوچا کہ عید کی مبارک باد دے دوں آپ کو۔۔۔ آپ سے تو اتنی امید بھی نہیں رکھی جاسکتی۔ کبھی کبھی اپنی انگلیوں کو بھی تھوڑی سی تکلیف دے دیا کریں۔ کم از کم مجھے جیسے تنہا شخص کو کچھ خوشی ہی مل جائے گی۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کے وقفے کے بعد وہ پھر بولا۔۔

”اور سنائیں! کیا حال چال ہیں آپ کے؟ اتنے دن گزر گئے مگر آپ نے کوئی خبر خبر ہی نہیں لی ہماری۔“

”آپ نے بھی تو کوئی خبر نہیں لی۔ آخری دفعہ جب ہماری بات ہوئی تھی تو شاید میں بہت ڈپر بسڈ تھی۔“ وہ

دھیرے سے بولی۔

”آپ کا دکھ محسوس کر سکتا ہوں میں۔ میں نے ایک دو دفعہ کال کی تھی مگر آپ کا سیل فون بند ملا۔“

”فیضان صاحب! میں کوئی اتنی سوشل نہیں ہوں۔ میرا نمبر بھی بہت کم لوگوں کے پاس ہے اور بہت کم کوئی

مجھے کال کرتا ہے اس لئے ڈیوٹی آورز کے بعد میں اکثر اپنا سیل فون بند رکھتی ہوں۔“

”رائیل صاحبہ! میرے کچھ دوست آگئے ہیں میں آپ کو بعد میں کال کر سکتا ہوں؟“

”کیوں؟۔۔ کوئی خاص بات کرنی ہے آپ کو؟“

”نہیں۔۔۔ کوئی خاص بات تو نہیں ہے کرنی۔“

”تو پھر آپ کیوں بات کرنا چاہتے ہیں؟“

”سچ پوچھیں تو یہ تو مجھے بھی پتہ نہیں کہ میں آپ سے کیوں بات کرنا چاہتا ہوں۔“

رائیل کو اس کی سچائی اور سادگی پر بے اختیار پیار آ گیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”تو۔۔۔ پھر۔۔۔ ایسا کریں کے کچھ دن اس بات پر سوچ بچار کر لیں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ پھر کال کر

لیجئے Take Care۔“ کہتے ہوئے اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی اور خود بخود مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆

کئی روز ہو گئے مگر حسین نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ ایک دو بار زارا نے کال کی مگر اس نے ریسیو نہیں کی نہ ہی

اس نے زارا کے کسی میسج کا جواب دیا۔ زارا نے بھی سوچا کہ اس نے ”سودن“ مانگے تھے اسے بھی چاہئے کہ وہ

انتظار کرے مگر سو تو کیا اس سے کئی دن اوپر ہو گئے مگر اس نے رابطہ نہیں کیا۔ زارا نے پھر اسے کال کی مگر بار بار

کال رینجیکٹ ہو رہی تھی تب وہ پریشان ہوئی۔ اس نے شاہد کو کال کر کے پوچھا۔

”شاہد! تمہارا حسین سے کوئی رابطہ ہے؟“

”نہیں! تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”بہت دن ہو گئے ہیں اس نے رابطہ ہی نہیں کیا نہ ہی ملنے کے لئے آتا ہے۔“  
”کیا وہ تمہیں بتا کر نہیں گیا؟“ شاہد نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا؟“

”یہ۔۔۔ کہ وہ لوگ تو ایک مہینہ ہوا کراچی شفٹ ہو گئے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔ مگر۔۔۔ کیوں؟“ زارا نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا۔

”اس کے والد سرکاری سروس میں ہیں ان کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ پورا خاندان کراچی شفٹ ہو گیا حیرت ہے اس نے تمہیں نہیں بتایا؟“

”نہیں۔۔۔ نہ ہی کسی کال یا میسج کا جواب دے رہا ہے۔“

”کوئی جھگڑا ہوا ہے تم دونوں میں؟“

”ایسا کوئی خاص تو نہیں۔۔۔ مگر اس نے تو ٹائم مانگا تھا۔“

”زارا!۔۔۔ میں نے کبھی تم سے حسین اور تمہارے متعلق نہیں پوچھا۔۔۔ مگر۔۔۔ مجھے تم دونوں کے درمیان کئی دفعہ فاصلہ محسوس ہوا۔ تم لوگوں کا بہت نجی مسئلہ تھا اس لئے پوچھنا اچھا نہیں لگا۔“

”تم آؤ میرے پاس میں تمہیں بتاؤں گی۔“

”اس اعتماد کے لئے شکریہ! میں ضرور آؤں گا۔“

اس نے الوداعی کلمات ادا کر کے کال ڈس کنیکٹ کر دی اور راتیل نے سکون کا سانس لیا۔

مگر ایک دھڑکا تو دل کو لگ ہی چکا تھا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا اعتبار کر لیا جائے اور حالات اس کے خلاف کئی طرح کے ثبوت لے آئے تھے۔ ایک طرف حالات تھے۔۔۔ ایک طرف فیضان۔۔۔ اور بیچ میں اس کا دل تھا۔۔۔ جو ایک عرصے بعد آباد ہونے جا رہا تھا۔۔۔ جس کی بربادی کا اندیشہ بھی دل کو ہولادیتا تھا۔۔۔ اور یہ ابھی شروعات تھی۔۔۔۔۔





رمضان کا باہر کت مہینہ تھا۔ راتیل گلاں کے ساتھ فطاری کی تیاری میں مصروف تھی کہ شفن نے اسے آکر بتایا کہ اس کے روم میں اس کے موبائل پر بار بار کوئی کال کر رہا تھا۔ وہ ہاتھ دھو کر اپنے بیڈ روم میں آئی۔ آج بہت عرصے کے بعد فیضان کی کال آرہی تھی۔ اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے دھیرے سے ”ہیلو“ کہا تو وہ بولا۔۔۔  
 ”بہت دن گزر گئے آپ سے بات چیت نہ ہو سکی۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”اللہ کا احسان ہے آپ سنا نہیں؟“

”کچھ خاص نہیں۔ بس وہی روٹین لائف ہے۔“

”آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔“ راتیل بولی

”دس باتیں پوچھیں آپ۔“ وہ چمک کر بولا

”آپ صفیہ ناز کو جانتے ہیں؟“

”ہاں۔۔۔ کیوں؟“

”بس۔۔۔ کچھ نہیں ایسے ہی پوچھا تھا۔“

”نہیں۔۔۔ ایسے ہی تو نہیں پوچھا ہوگا۔ کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ؟“

”بس یونہی۔۔۔“

”میں بات سننا چاہتا ہوں۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا تو وہ انک انک کر کہنے لگی۔

”مجھے آپ کے متعلق اس تمام عرصے میں جتنی معلومات ملی ہے اس کے مطابق۔۔۔ آپ کی اسٹوڈنٹ لائف کا یہ تاثر رہا ہے کہ آپ بگڑے ہوئے رئیس زادے تھے اور۔۔۔ فلرٹ بھی۔۔۔ کچھ لڑکیوں سے آپ کا نام منسوب رہا ہے۔۔۔ اب صفیہ ناز کا۔۔۔ بھی۔۔۔“

”جھوٹ ہے یہ سب، فضول لوگوں کا کام ہی فضول باتیں کرنا ہوتا ہے۔ میری آپ سے صرف ایک request ہے کہ آپ مجھے صرف اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اپنی سمجھ سے مجھے پرکھیں۔۔۔ پھر جو بھی رائے قائم کریں، مجھے اس سے آگاہ کر دیجئے گا۔“

وہ ایک دم غصے میں آ گیا وہ گھبرا گئی اور بہانہ بنایا۔۔

”او کے فیضان صاحب پھر کبھی بات کریں گے۔ میں اس وقت افطاری کی تیاری کے لئے کچن میں مصروف تھی۔“

”اوہ سوری! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ میں پھر کال کر لوں گا۔“

اس نے الوداعی کلمات ادا کر کے کال ڈسکنکٹ کر دی تو راتیل نے سکون کی سانس لی۔

رمضان کا آخری ہفتہ تھا جب وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ فیضان کی کال آ گئی۔

”کیسی ہیں آپ؟ عید کی تیاری کیسی چل رہی ہے؟“ وہ بڑے ہشاش بشاش لہجے میں بولا تو راتیل دکھی ہو گئی اور بولی۔

”میری اب کوئی عید نہیں آتی۔“

فیضان اس کے اداس موڈ کو تھدیل کرنے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا کہ راتیل کو آج کی بات یاد آئی اور کہنے لگی۔

”ہمارے ڈپارٹمنٹ کا ٹیوٹال جو آپ ہی کے گاؤں کا ہے، آج اس نے آپ کا ذکر کیا تب مجھے پتہ چلا کہ آپ تو اپنے گاؤں میں اکثر فلاجی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کے گاؤں میں ایک اسکول اور ایک ہسپتال آپ ہی کی کوششوں سے کھلا ہے۔ وہ آپ کی بہت تعریف کر رہا تھا۔“

”خدا کا شکر ہے کہ آپ نے میری تعریف بھی سنی اور ایک کریکٹر سٹوکیٹ مجھے ملا۔“

راتیل کو ہنسی آ گئی آج وہ بھی کافی موڈ میں تھا۔ مختلف موضوعات پر بات چیت کرتے کرتے اس نے اچانک کہا۔

”تو پھر۔۔۔ کب ملاقات کر رہی ہیں آپ مجھ سے؟“

”آپ کو اس سلسلے میں میرا جواب اچھی طرح معلوم ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی تو وہ اسے تنگ کرنے والے اسٹائل میں کہنے لگا۔

”میں بتاؤں کہ آپ مجھ سے ملنے سے کیوں کتراتے ہیں؟“

”کیوں۔۔؟ بتائیں۔۔۔“

”اس لئے کے آپ مجھے فیس نہیں کر سکتیں۔ یہ جو آپ نے اپنے اوپر ایک مصنوعی خول چڑھا رکھا ہے جس کے اندر آپ خود کو بہت محفوظ سمجھتی ہیں مگر آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں اس خول کو توڑنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔“

”اوہ۔۔۔ ہو۔۔۔ اہی خوش فہمی پلس غلط فہمی ہے جناب کو۔۔۔“

وہ تڑ سے بولی تو فیضان نے زوردار قہقہہ لگایا اور پھر خوشدلی سے بولا۔

”آپ سے بات چیت کر کے بڑا مزا آتا ہے۔ تو پھر اب آپ کب کال کریں گی مجھے؟“

”میں کیوں کال کروں گی؟ آپ خود ہی کریں گے جناب۔“

”اچھا جی!۔۔۔ تو آپ طے ہوا کہ جب تک آپ کال نہیں کریں گی تو میں بھی نہیں کروں گا۔“

”او کے۔۔۔ دیکھیں گے۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”اپنا بہت خیال رکھا کریں بائے۔“ کہتے ہوئے اس نے کال ڈسکلیٹ کر دی۔

☆.....☆.....☆

”ایک بات کہوں اگر آپ ناراض نہ ہوں؟“ شاہد نے اس کی پوری بات سننے کے بعد کہا۔  
”کہیں!“

”سچ پوچھیں تو مجھے اندازہ تھا کہ حسین اگر سنجیدہ ہوتا تو بہت پہلے ہی آپ کو اپنا لیتا۔“

”آخر اس نے مجھے بتایا کیوں نہیں جانے سے پہلے اور میری کوئی کال بھی انیڈ نہیں کی اور مجھے لگتا ہے کہ

اس نے میرا نمبر ہی بلاک کر دیا ہے۔ یہ سنیں۔۔۔۔۔“

زارا نے حسین کا نمبر ڈائل کر کے اپنا سیل فون شاہد کو دیا۔ اس نے سنا اور اسے اس کا فون واپس کرتے

ہوئے کہا۔

”میرے فون سے نمبر ملا کر چیک کریں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سیل فون زارا کو دے دیا۔

زارا نے حسین کا نمبر ڈائل کیا تو چونک گئی کیونکہ ٹون جا رہی تھی اور پھر اس نے حسین کی آواز سنی۔

”ہیلو“ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے شاہد نے اس کے ہاتھ سے سیل فون لے کر کہا۔۔

”یار کہاں ہو آج کل؟ بالکل بھلا دیا ہے کچھ لکھ کر دو ہمارے جریدے کے لئے۔“

ایک دو منٹ تک اس نے اس سے اسی قسم کی باتیں کر کے کال ختم کی تو دیکھا کہ ذرا غصے سے کھول رہی تھی ”وہ اتنا گھٹیا نکلا کہ میرا فون نمبر ہی ہلاک کر دیا ہے؟ اسے مجھ سے شادی نہیں کرنی تھی نہ کرتا مگر طریقے سے اپنا فیصلہ سنا کر اور اطلاع دے کر جاتا۔ اسی کے دعوے تھے محبت کے۔۔۔۔ میں نے فقط اپنی روائتی مجبور یوں کی بنا پر اس کو فوقیت دی، اہمیت دی۔۔۔۔ اس میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ میں اس کا انتظار کرتی۔۔۔۔“

یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔۔۔ شاہد کو بہت دکھ ہو رہا تھا اس پتویشن پر۔

”میں نے آپ سے اپنا سیل فون اس لئے فوراً لے لیا کہ کہیں جذبات میں آپ میرے نمبر سے ہی اسے کچھ کہہ نہ بیٹھیں۔ اب آپ صرف ایک وعدہ کریں کہ آپ اس سے کامیاب کر کے بات نہیں کریں گی۔۔۔ کچھ نہیں کہیں گی۔“

”میں اسے چھوڑوں گی نہیں کراچی دور نہیں ہے۔ میں نے اسے ذلیل نہ کیا جا کر تو میرا نام نہیں۔۔۔ دھوکے باز انسان۔۔۔ کیا سمجھا ہے اس نے مجھے؟“

”آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی۔ خود کی پہچانیں آپ اتنی بڑی حیثیت ہے۔ ادب میں، سماج میں۔ آپ کو اسے احساس دلانا چاہئے کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے آپ کے لئے۔“

”اگر اس نے خود رابطہ کیا تو؟“

”نہیں کرے گا۔ مجھے یقین ہے۔ اور اگر کرے بھی تو اب آپ اس سے نہ کوئی بات کریں گی نہ رابطہ رکھیں گی۔ یہی اس کی سزا ہے۔ وعدہ کریں۔۔۔۔“

ذرا کی آنکھوں سے آنسو گرتے رہے۔ کچھ نہ بولی۔

”ہو سکتا ہے کہ کبھی آپ کے دل میں میرے لئے یہ شک ابھرے کہ میں نے بھی بہت پہلے آپ سے چاہت کا اظہار کیا تھا۔۔۔ سو۔۔۔ کہیں میں رقابت میں یا معاملات خراب کرنے کے لئے تو ایسا نہیں کر رہا تو یقین کریں کہ ایسا نہیں ہے۔ میں بات کو دل میں نہ رکھ سکا اور اظہار کر دیا یہ میری بے وقوفی تھی۔ جب کہ پتہ تھا



کہ آپ کی اور میری کلاس میں بہت فرق ہے۔ آپ ہیں اتنی اچھی کہ نجانے کتنے

لوگ آپ سے شادی کے خواہش مند ہوں گے مگر ذات پات کی اونچ نیچ کی روایات کو سمجھتے ہوئے بات نہیں کر سکتے۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ اپنی قدر پہچانیں۔۔۔۔۔“

وہ بھلا اسے کیا دلا سادیتا۔ جانتا تھا کہ وہ کھل کر رونا چاہتی ہے۔ اچھا ہے۔۔۔۔۔ خوب رو لے۔۔۔۔۔ دل ہلکا ہو جائے گا۔ وہ اسے اپنا خیال رکھنے کا کہہ کر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

عید کا دن آیا مگر راتیل کے لئے وہی روکھا پھیکا رہا۔ دن کو بہنیں آگئیں مگر رات کو ان کے جانے کے بعد پھر وہ تھی اور اس کی تنہائی دن بھر اس کے کان موہاں ٹون پر لگے رہے مگر آج تو فیضان نے بھی کال نہیں کی تھی۔ اسے بار بار یہ بات یاد آ رہی تھی۔ کہ فیضان نے اس سے کہا تھا کہ اب کی بار راتیل نے کال کرنی ہے جب تک وہ اسے کال نہیں کرے گی، وہ اس سے دوبارہ بات نہیں کرے گا۔ تو کیا واقعی یہ بات اس نے سنجیدگی سے کہی تھی؟

دوسری صبح وہ نیند سے جاگی تو اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا۔ صرف چائے پی تھی۔ عجیب سی بے چینی تھی اس کے اندر۔ وہ اپنے اس انداز سے واقف تھی کہ بہت عرصے کے بعد وہ پھر شدید ڈپریشن میں جا رہی تھی خود کو بہلانے کے لئے کبھی ٹی وی دیکھتی تو کبھی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتی مگر دل بڑا گھبرا رہا تھا اس کا۔ دل چاہا تھا کہ زور زور سے روئے چپے مگر ضبط کئے رہی پھر اسے فیضان کی یاد آئی۔ اس نے اس سے بات کرنے کے لئے دو تین مرتبہ موہاں اٹھایا۔۔۔۔۔ نمبر ڈائل کرنا چاہا مگر کال نہ کی۔ پھر ایک بار موہاں اٹھایا اور اس کا نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف سے اس کی ننداسی ”ہیلو“ سنائی دی وہ ابھی تک سو رہا تھا۔ اس کے منہ سے بھی ”ہیلو“ نکلا مگر پھر اس نے فوراً کال ڈسکلیکٹ کر دی اور سو چنے لگی۔

”آخر میں کیوں فیضان کی عادی ہوتی جا رہی ہوں؟ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں؟ کیوں ایسے راستے پر قدم رکھنا چاہ رہی ہوں جس کی منزل کا کچھ بھی اتنا پتا نہیں؟۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ مجھے لوٹ آنا چاہئے۔ ورنہ یہ میری ٹھکست ہوگی۔ کیا اب میں اتنی کمزور بن گئی ہوں کہ فیضان کا سہارا لینا چاہیے؟“

ابھی ایک گھنٹہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ فیضان نے اسے کال کی۔

”رائیل! جیلو کہنے کے بعد کال کیوں ڈسکنیکٹ کر دی تھی؟ بات کیوں نہیں کی؟“

”وہ۔۔۔ بس۔۔۔ لائن کٹ گئی تھی۔“ وہ گڑبڑا کر بولی۔

”کیا دوبارہ کال نہیں کی جاسکتی تھی؟“ وہ پھر بولا تو وہ خاموش رہی کہ اس کے پاس اس کے سوال کا کوئی

جواب ہی نہیں تھا۔

”خاموش کیوں ہیں؟ جواب دیں۔“

رائیل کے اندر سے آنسوؤں کا سیلاب تمام بند توڑ کر بہہ نکلا۔ وہ بے تحاشہ رونے لگی۔ اس کی ہچکیوں کی

آواز سن کر فیضان بہت بے چین ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ سمجھانے لگا۔

”رائیل پلیز۔۔۔ خود کو سنبھالیں دکھ اور سکھ زندگی کا لازمی حصہ ہیں پھر اس طرح خود کو بکھیر دینے سے

مسائل تو حل نہیں ہونے ناں۔۔۔ دیکھیں۔۔۔ میں نے آج تک آپ سے آپ کے ماضی کے متعلق کچھ بھی نہیں

پوچھا۔ مگر آج میں چپ نہیں رہوں گا۔ دکھ شیر کرنے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے بتائیں پلیز۔۔۔“

اور۔۔۔ پھر۔۔۔ ہچکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ وہ فیضان کو بتانے لگی۔

☆.....☆.....☆

رائیل نے بہت خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ سب بہن بھائیوں سے بڑی تھی۔ دو بہنیں اور دو

بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ ان کا ساتھ افراد پر مشتمل خاندان بہت آئیڈیل تھا۔ اس کے والد نامور سرجن تھے،

انہوں نے تمام بچوں کو بہترین تعلیم دلوائی تھی۔ ان کا ماحول بہت روشن خیال تھا۔

رائیل ایک **Born Artist** (پیدائشی فنکار) تھی۔ ابھی اسکول میں ہی تھی کہ کتنے ہی مصوری کے

مقابلوں میں حصہ لیا اور اعزازات و انعامات حاصل کئے۔ کالج میں آئی تو اسے ملکی سطح کے ایک مقابلے میں بھیجا

گیا جہاں سے وہ اپنے کالج کے لئے پہلی پوزیشن جیت کر لائی۔ وہ اپنے اساتذہ اور کلاس فیلوز میں بہت مقبول

تھی۔ کھلتے ہوئے رنگ پر گہری سیاہ آنکھیں گھنے اسٹائلش کٹ کے بال نازک سی لڑکی سب کو بھا جاتی تھی۔

ایک دفعہ اس کو ملک سے باہر بھی اپنا تخلیقی کام دکھانے کا موقع ملا جہاں سے بھی اسے بہت اچھا ریسپانس ملا۔

اس کے والدین اس کی کامیابیوں پر بہت خوش ہوتے اور فخر کرتے۔ بہن بھائی بھی پھولے نہیں سماتے۔

اس کے آرٹ کے جنون کو دیکھتے ہوئے اس کے والدین نے یونیورسٹی میں اسے آرٹ اینڈ ڈیزائن کے شعبے میں بھیجا۔ اب تو وہ اور بھی فن کی دنیا میں گم ہو گئی۔ آرٹ کی تعلیم کے ساتھ وہ وہی پر منعقدہ نمائشوں میں حصہ لیتی اور اپنے مچھور کام سے سب کو حیران کر دیتی تھی۔ اب اسے میڈیا میں بھی شہرت ملنے لگی۔ اس کے انٹرویوز اخباروں اور میگزین میں چھپتے۔ ریڈیو اور ٹی وی میں ٹاک شو میں بلایا جاتا۔ اس کی اتنی کم عمری میں ہی آرٹ کے شعبے میں جان پہچان ہو گئی اور اسے اتنی سٹائش ملی جو اکثر آرٹسٹوں کو بہت دیر میں نصیب ہوتی ہے۔

اب اس کے لئے کچھ مسائل بھی بڑھے وہ محسوس کرتی کہ یونیورسٹی کے لڑکے اور میڈیا کے نمائندے بہانوں بہانوں سے اس سے بات کرتے اور دوستی کرنا چاہتے۔ اس کے موبائل پر بے شمار پیغامات آتے انجانے نمبروں سے۔ دشمن کارڈز آتے تب وہ تھوڑا محتاط رہنے لگی کہ چاہے اس کے گھر والے کتنے ہی Broad minded کیوں نہ ہوں مگر جس سوسائٹی میں وہ رہتی تھی وہ تضادات کا شکار تھی۔ یہ معاشرہ male dominating معاشرہ تھا جہاں مردوں اور عورتوں کی آزادی کے الگ الگ معیار ہوتے ہیں وہ کم عمری میں بھی سمجھ گئی تھی کہ اگر اس کا کوئی اسکینڈل بنا تو وہ اس کی ساری زندگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس کے والدین نے اسے آزادی ضرور دی تھی مگر تربیت بھی بہت اچھی کی تھی تاکہ وہ اپنا ہما بھلا سمجھ سکے۔

اب اسے مختلف لوگوں سے واسطہ بھی پڑنے لگا۔ اسے بھیڑیے نما لوگوں کی نظریں برداشت کرنا پڑتی جو اپنے اوپر اخلاق کا خول چڑھائے پھرتے۔ اس کے آس پاس ہر طرح کی نظریں ہوتیں۔۔۔ طنزیہ، نظریں۔۔۔ بھوکی نظریں۔۔۔ کبھی گندی ذہنیت رکھنے والوں کے عجیب دل دکھانے والے فقرے سننے کو ملتے تو وہ ڈپریشن بھی ہو جاتی تھی اکثر۔۔۔ مگر ان کے علاوہ پر خلوص اور پیار کرنے والے لوگ بھی تھے جن کے رویوں سے اسے حوصلہ ملتا۔ کچھ لڑکے اس کی طرف خلوص سے بڑھے مگر وہ بہت رزرو (Reserve) رہی تو وہ مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ بہت ہی زیادہ رزور رہتی کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ آرٹ، ادب اور میڈیا میں آنے والی لڑکیوں کو ایک ایک قدم محتاط ہو کر اٹھانا چاہئے ورنہ پھر کوئی کمزوری ہاتھ آتے ہی لوگ کہانیاں بنانے کے لئے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔

ایک طرف تو وہ گھر سے باہر کی اپنی دنیا کے مسائل فیس کر رہی تھی تو دوسری طرف وہ عام لڑکیوں سے مختلف ہونے کی وجہ سے ان مسائل کو فیس نہیں کر سکی جو رشتے ناتوں کے حوالے سے لڑکیوں کو فیس کرنے پڑتے ہیں۔ کیونکہ اسی سوچ اور life style بہت مختلف تھا۔

پھر یہ ہوا کہ ہر گھر کی طرح جب اس کے گھر میں بھی ایسی خواتین کا آنا جانا شروع ہو گیا جو اپنے بیٹوں کے لئے رشتے پسند کرنے کے لئے کم از کم چالیس گھر تو ضرور دیکھتیں ہیں، تب بیٹوں کی ماں ہونے کے ناتے اس کی امی بھی اسے کسی شوپس کی طرح ان کے سامنے پیش کرنا چاہتیں تو وہ شدید رد عمل دکھاتے ہوئے صاف انکار کر دیتی۔۔۔ کیونکہ اسے اس رسم سے شدید نفرت تھی اور وہ کہا کرتی۔۔۔

”اگر میں اس سوسائٹی کی اس گندی رسم کو ختم نہ کر سکتی ہوں تو نہ سہی مگر خود کو اس سسٹم کا حصہ ہرگز نہیں بناؤں گی۔“

ماں نے بہت سمجھایا، بہنوں نے سمجھایا، فرینڈز نے قائل کرنا چاہا مگر وہ نہ مانی پھر یہ ہوا کہ اس کی شادی تو نہیں ہو سکی مگر اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کی شادیاں پہلے ہو گئیں۔ مگر اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اسے تو صرف اپنے فن سے عشق تھا اور دل میں ایک یقین سا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی تو ایسا آئے گا جو فقط اس کی ذات سے پیار کرے گا، اس کے سوشل اسٹیٹس کی وجہ سے نہیں۔ پھر چاہے وہ کوئی افسانوی رومانوی شہزادہ نہ ہو، کوئی عام سا شخص ہو جو قدم قدم پر اس کے ساتھ رہے۔ اس کی شخصیت اور فن کی قدر کرے اس کے دل میں بہت پیار تھا اس انجانے شخص کے لئے مگر۔۔۔ اس کے نصیب میں ایسا شخص نہیں تھا۔ مگر۔۔۔ کیوں۔۔۔؟ عام سی لڑکیوں کو بھی ان کیے قدر دان مل جاتے ہیں تو پھر اسے کوئی کیوں نہیں ملا؟۔۔۔ ہاں۔۔۔

اب وہ ایک بات سمجھ چکی تھی کہ آرٹ، ادب اور میڈیا سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں سے متاثر ہونے والے تو بہت ہوتے ہیں مگر پھر بھی وہ ان کے کردار کے بارے میں مشکوک رہتے ہیں یا پھر ان کو قبول کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔۔۔ ظرف نہیں ہوتا کیونکہ ٹھیک ٹھاک اعلیٰ کچھ نسل مرد بھی ایسی لڑکیوں سے شادی کرنے سے گھبراتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی شخصیتوں کے آگے وہ دب جائیں۔۔۔ اور یہ بات اس سماج کے مردوں کے لئے قابل قبول نہیں تھی۔



وقت گزرا تو دونوں چھوٹے بھائیوں کی بھی شادیاں ہو گئیں۔ اب وہ دکھ سے بھی آشنا ہوئی جب اچانک اس کا والد بھی دنیا سے چلا گیا۔ ماں بھی بیمار رہنے لگی تھی۔ اب وہ بار بار اس کے شادی کرنے کے لئے کہتیں۔۔۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ وہ اس کی آخری خواہش سمجھ کر شادی کے لئے ہاں کہہ دے یہ بھی کہا کہ اگر وہ کسی کو پسند کرتی ہے تو بتائے ورنہ ان کے فیصلے کو قبول کر لے۔

شادی۔۔۔ کوئی کھیل ہے؟۔۔۔ مگر اٹل حقیقت تو ہے۔۔۔ پھر۔۔۔ مجھے تو کوئی نہیں دکھتا ایسا شخص جو مجھے سمجھ سکے۔۔۔“

اس نے اپنے ارد گرد کے لوگوں کو منڈلاتا تو نظر ریاض حسین پر ٹھہر گئی۔ وہ اسے دوست کہتا تھا مگر ڈھکے چھپے لفظوں میں محبت کا اظہار بھی کرتا رہتا تھا مگر اسے اس سے اس لحاظ سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔ اچھی فیملی سے تھا ڈاکٹر تھا اور ٹی وی کا مقبول ڈرامہ رائٹر بھی تھا۔ ڈراموں سے تو لگتا کہ وہ بہت سمجھدار اور حساس تھا۔ وہ اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا مگر وہ حسبِ عادت رزرو ہی رہتی اس نے سوچا کہ اس نے اسے کھل کر بات کرنے ہی نہیں دی تھی۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی اسے ڈائریکٹ اس سے بات کرنی چاہئے۔ وہ بھی عام آدمی نہیں تھا۔ ڈرامہ رائٹر اور ادیب تھا وہ دونوں کھل کر بات کر سکتے تھے۔ یہ سوچ کر ایک دن وہ اس کے شاندار آفس میں پہنچ گئی۔ اس نے بولڈ اسٹائل میں اس سے پوچھا تھا۔

”آپ مجھے بہت پسند کرتے ہیں ناں؟“

ریاض اس کے اس اچانک سوال پر چونک پڑا تھا اور کہا تھا۔

”اس میں کیا شک ہے؟“

”مگر آپ نے کبھی بھی مجھے پروپوز نہیں کیا۔ کیوں۔۔۔؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”تم سے شادی کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ ہم صرف اچھے دوست ہیں۔“

”مگر۔۔۔ ہم جس سوسائٹی میں رہتے ہیں وہاں عورت اور مرد کے بیچ میں دوستی ممکن ہی نہیں ہے۔ ان کے

بیچ یا رومانس ہوتا ہے یا پھر فلرٹ۔“

”رومانس تو دوستی کا حصہ ہے۔“

”اور۔۔۔ شاید فلرٹ بھی۔۔۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا۔“

”تو پھر شادی کے لئے کیوں نہیں سوچا؟“

”شادی میں کروں گا۔۔۔ مگر۔۔۔ کسی۔۔۔“ وہ تھوڑا جھجکا ہی تھا کہ رائیل بول پڑی۔

”کسی سیدھی سادی۔۔۔ گھریلو لڑکی سے۔ آرٹسٹ، ادیبہ یا فنکارہ سے نہیں کیونکہ میری بیوی کو صرف میرا

ہونا چاہئے۔ وہ پبلک فلرٹ نہ ہو۔“

اس نے کھسیانہ ہو کر کہا۔۔۔

”کچھ ایسا ہی ہے۔“

”اور آپ کے خیال سے، وہ لوگ بے وقوف ہوتے ہیں جو نہ صرف ان شعبوں سے وابستہ لڑکیوں سے

شادی کرتے ہیں اور پھر اچھی گھریلو زندگی بھی گزارتے ہیں؟“

”اپنے اپنے طرف کی بات ہے۔“

”واقعی یہ تو آج میں نے دیکھ ہی لیا کہ آپ کتنے کم ظرف انسان ہیں آپ میرے ساتھ صرف وقت

گزاری کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے میرے کوئی جذبات اور احساسات نہیں ہیں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ ایک دن

مجھے ضرور پروپوز کریں گے۔“

”کم آن یارا۔۔۔ تم بھی عام لڑکیوں کی طرح نکلیں؟ انسان جو جہاں سے جتنا بھی پیار ملے دونوں ہاتھوں

سے سمیٹنا چاہئے۔“

”شٹ اپ! مجھے تمہارے جیسے مردوں سے ایسے so called پیار کی نہ تو ضرورت ہے اور زندگی میں

نہ کبھی پڑے گی۔“

اس نے رائیل کی اس بات پر زوردار قہقہہ لگایا تو وہ غصے میں پھمکی ہوئی اس کے آفس سے نکل آئی۔ وہ

تیزی سے کارڈ رائیو کرتی گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کے کانوں میں ریاض کا طنز اور حقارت بھرا قہقہہ گونجتا

رہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے رائیل کو بلند یوں سے پستیوں کی طرف دھکا دے دیا تھا۔

”کیا ضرورت تھی مجھے اس سے بات کرنے کی؟ یہ میں نے کیا کیا؟۔۔۔ اف۔۔۔ اتنی ذلت کا احساس تو کبھی نہ ہوا تھا زندگی میں۔۔۔“ وہ سوچتی رہی جب خواتین اس کے گھر رشتہ دیکھنے کے حوالے سے آتیں تو وہ اس لئے ان کے سامنے نہیں جاتی تھی کہ وہ جانتی تھی کہ زیادہ تر صرف، ونڈو شاپنگ کے لئے آتی تھیں۔ اسے دیکھنے کے بعد اگر وہ اسے رنجیکٹ کریں گی تو اسے کس قدر ذلت کا احساس ہوگا؟؟؟۔۔۔ ہر حساس لڑکی کو ہوتا ہے یہ احساس۔۔۔ مگر آج اسے وہ ذلت بھی برداشت کرنا پڑی۔۔۔ وہ جو سمجھتی تھی کہ اس کا فن اس کی قدر میں اضافہ کرتا ہے۔ مگر آج پتہ چلا کہ اس مارکیٹ میں عام لڑکیوں کی زیادہ ویلو ہے وہ بظاہر سیدھی سادی سی لڑکیاں جو آگے چل کر شوہروں کو جوڑنے کی نوک پر بھی رکھتی ہیں۔

وہ گھر پہنچ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے اندر ایک طوفان تھا دماغ میں سائیکس سائیکس ہو رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ درد کے پنجوں نے دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔ آج اس نے ریاض کا دوسرا روپ دیکھا تھا۔ یہ ادیب اور اعلیٰ نسل لوگ اپنے تحریروں میں کتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں مگر ان کا اصل روپ لوگوں سے اوجھل ہوتا ہے۔

آخر یہ شادی میرے لئے مسئلہ کیوں بن گئی ہے؟ کیوں آج تک کسی نے مجھ سے پیار کیا اور نہ پیار سے اپنانا چاہا؟ عام لڑکیوں کے لئے مرد کیا کچھ نہیں کرتے؟ محبت بھی کرتے ہیں اور اس بندھن کو شادی جیسے مضبوط رشتے میں بھی بدلتے ہیں۔ پھر۔۔۔ میرے لئے۔۔۔ کوئی بھی نہیں ہے۔۔۔؟؟؟

کیا کمی ہے مجھ میں آخر؟ جاہل نہیں ہوں، بد صورت نہیں ہوں۔۔۔ بد کردار نہیں ہوں۔۔۔ بے سلیقہ نہیں ہوں۔۔۔ میرے سینے میں تو پیار بھرا دل ہے۔۔۔ ہر عورت کی طرح اس کے دل میں بھی ارمان ہے اپنا گھر بسانے کا۔۔۔ اسے سجانے سنوارنے کا۔۔۔ جیون ساتھی کے پیار کے سائے میں زندگی کا خوبصورت سفر طے کرنے کا۔۔۔ مگر۔۔۔ آج پتہ چلا کہ ریاض جیسا شخص ہی مجھے قبول نہیں کر سکتا تو پھر کسی اور سے کیا امید۔۔۔۔۔

کیا شادی زندگی کا حاصل ہے؟۔۔۔ کیا شادی ہر مسئلے کا حل ہے؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں ہے۔۔۔ کیونکہ شادیاں تو ناکام بھی ہو جاتی ہیں عورتیں تو جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ مگر۔۔۔ جہان ہمارا مذہب طلاق یافتہ

اور بیواؤں کی دوسری شادی کے لئے تلقین کرتا ہے وہاں اگر وہ کرتا چاہیں تو لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔۔۔۔۔ طرح طرح کی باتیں بتاتے ہیں کنواری لڑکیاں بیٹھی ہوں تو پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ۔۔۔

”شادی نہیں ہوئی؟“

حقیقت میں شادی لڑکیوں کے لئے زندگی اور موت کا ایسا ٹوٹنہا ہے، مگر اسے بنا دیا جاتا ہے لوگ اپنے رویوں سے اس قدر تکلیف پہنچاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ شادی نہ کر کے جیسے لڑکیاں گناہ یا جرم کرتی ہوں۔ ہاں شادی ہو جائے۔۔۔ اور بھلے سے ناکام ہو جائے۔۔۔ پھر سب کو چین مل جاتا ہے۔

رائیل کا دل بھرا یا طوفان نے دل سے آنکھوں کی طرف رخ کیا تو جل تھکلی برسات ہونے لگی پھر وہ زور  
زور سے رونے لگی۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اچانک

جنونی طریقے سے اٹھی اور اپنی پیٹنگز اٹھا اٹھا کر زمین پر پھینکے لگی۔۔۔ ہر ریک سے تمام میڈلز اور دیوار ڈز اٹھائے۔ ان کو زور زور سے دیواروں پر دے مارا۔۔۔ سر ٹیکلیٹس کے پرزے پرزے کر دیئے۔۔۔ وہ روتی جا رہی تھی اور چیخ چیخ کر کہتی جا رہی تھی۔

”نہیں چاہئیں مجھے یہ سب۔۔۔ کسی کام کا نہیں یہ سب۔۔۔ میں بہت بری ہوں۔۔۔ بدکردار ہوں۔۔۔ مجھے کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔۔۔ نہیں چاہئیں مجھے۔۔۔“

شور شرابا سن کرامی اور بھابھیاں اس کے کمرے کی طرف دوڑیں۔ وہ جنونی انداز میں اپنے بال فوج کرو رہی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا۔ وہ روتی روتی بے ہوش ہر کر بیڈ پر گر پڑی اسے ہاسپٹل لے جایا گیا جہاں کچھ دنوں کے لئے اسے ایڈمٹ کیا گیا۔ رپورٹس وغیرہ ہوئیں۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا اس کے ذہن پر کسی صدمے کا اثر ہے۔ اسے مکمل سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔

ہاسپٹل سے وہ گھر آ گئی مگر اب وہ پہلے والی راتیل نہیں رہی۔ ہر وقت چپ رہتی یا خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ امی نے پوچھا۔۔۔ بھابیوں نے پوچھا۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ انہیں کیا بتاتی؟ کیسے اپنے دکھ کا احساس دلاتی؟۔۔۔ بچپن اور نوجوانی کا دور اس قدر خوبصورت گزرا۔ مگر کیا پتہ تھا کہ آگے اب دکھ ہی دکھ ملیں گے۔ پیار



کرنے والے بابا نہ رہے۔ اس کی تمام خوبصورت شخصیت اور فن کو چھوڑ کر اب لوگ اسے صرف شادی کی کسوٹی پر پرکھنے لگے۔ اگر وہ بہت آزاد خیال آرٹسٹ طبقے سے ہوتی تو پرواہ بھی نہیں کرتی۔ گھومتی پھرتی۔۔۔ آرٹسٹوں کے سرکل میں رہتی اور زندگی کو انجوائے کرتی۔ مگر اس کا تعلق ایک روایتی گھرانے سے تھا۔ نہ تو وہ روایتی ماحول میں ایڈجسٹ ہو رہی تھی اور نہ ہی آزاد خیال طبقے میں۔۔۔

پھر۔۔۔ وہ اپنی امی کی ضد کے آگے ہار گئی اور جو رشتہ انہوں نے اس کے لئے پسند کیا تھا وہاں چپ چاپ شادی کر لی۔

☆.....☆.....☆

زارا کے لئے حسین کا رویہ بہت تکلیف دہ تھا اس نے تو سالوں سے اس کے سنگ جیون بتانے کے خواب دیکھ لئے تھے۔ مستقبل کے خوبصورت سے گھر میں وہی اس کا جیون ساتھی ہوگا کیسے بھلا دے وہ سب محبت کے شدید اظہار، وہ وعدے جو اس نے کیے تھے سب سے بڑھ کر اس نے یوں بنانا فیصلہ بتائے ہی چلے جانے سے اس کی سخت توہین کی تھی۔ اس کا نمبر بلاک کر کے اس کی انسٹ کی تھی۔ توہین کا یہ احساس چھوڑ کر چلے جانے کے احساس پر غالب تھا۔ اس نے کئی مرتبہ ایک دوسری سیم سے اس کا نمبر ملایا اور ول چاہا کہ اسے ایسا ذلیل کرے کہ زندگی بھر یاد رکھے۔۔۔ اس کی آواز سن کر وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اسے شاہد سے کیا ہوا اپنا وعدہ یاد آیا۔ کتنا مشکل تھا خود پر قابو رکھنا۔۔۔ خود کو روکنا۔۔۔ اور پھر مستقبل بھی اندھیرا سا لگ رہا تھا۔

کتنی ٹیلنٹڈ تھی وہ۔ ایک بہت اچھی رائٹر۔۔۔ جس کا نام بھی تھا اور کام بھی مگر یوں۔۔۔ کوئی اسے سے ایسا برتاؤ کرے؟ آخر وہ خود کو سمجھتا کیا تھا۔۔۔ آسمان سے اتری ہوئی مخلوق یا کوئی شہزادہ۔۔۔

بہت رونے اور تڑپنے کے بعد اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔ کہ اگر وہ اپنی کمیونٹی سے باہر شادی نہیں کر سکتی تو پھر وہ کبھی شادی ہی نہیں کرے گی۔

☆.....☆.....☆

جب تک لڑکی کی شادی نہیں ہوتی لوگ اس سے بار بار شادی نہ ہونے کا سبب پوچھتے ہیں۔ شادی ہونے کے بعد کسی کو فکر نہیں ہوتی کہ وہ شادی سے پہلے بہتر زندگی گزار رہی ہے یا پھر اب۔۔۔

رائیل کی امی کو اس کی شادی کی فکر تھی سو اس نے ان کی خوشی کے لئے اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ لڑکیوں کے لئے شادی کا بندھن بہت خوشیاں لے کر آتا ہے مگر رائیل کے لئے تو جیسے عذابوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے شادی کے وقت یہ سوچ لیا تھا کہ اب وہ ایک عام گھریلو زندگی گزارے گی۔ وہ لوگوں کی اور خاص طور پر آرٹ اور ادب کے شعبے کے لوگوں کی منافقتیں دیکھ چکی تھی کہ گھر سے باہر کی دنیا میں عورت کی عزت نہیں ہے اور عورت کا صحیح مقام تو صرف اس کا گھر ہے۔ اس لئے اس نے شادی کے بعد اپنی سوشل لائف تقریباً ختم کر دی تھی۔ مگر آصف علی بھی ان مردوں میں سے تھا جو اعلیٰ تعلیم حاصل کت کے، فل سوٹ پہن کر انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور اعلیٰ سوسائٹی کے اسٹیشنز کا سہل بنی کسی کلب کو جوائن کر کے بظاہر روشن خیال اور ماڈرن لگتے ہیں مگر اندر سے وہی روایتی سوچ رکھنے والے شادست مرد ہوتے ہیں جو کسی ایسی عورت کو قبول نہیں کر پاتے جس کی اپنی ایک بھرپور شخصیت ہو اور سوسائٹی میں پہچان ہو۔ حالانکہ رائیل تو اب پوری گھریلو عورت بن چکی تھی۔ اس نے اپنے گھر کو بہت خوبصورت طریقے سے سجایا تھا کہ ہر کوئی اس کے سکھڑاپے کی تعریف کرتا۔ امی کو تو یہ خوف رہتا تھا کہ ہر وقت رنگوں اور تصویروں کی دنیا میں گم رہنے والی لڑکی اپنا گھر اور ذمہ داریاں سنبھال بھی پائے گی یا نہیں۔ مگر اب اسے دیکھ کر وہ فخر محسوس کرتیں۔ اس نے تو کچن بھی بہت اچھے طریقے سے سنبھال لیا تھا سب خوش اور مطمئن تھے سوائے آصف کے۔۔۔۔۔ کیونکہ سوشل سرکل اور آرٹ کی دنیا کو چھوڑنے کے بعد بھی اس کی سوسائٹی میں پہچان تو اب بھی تھی۔ وہ جب اس کے ساتھ باہر جاتا اور لوگ رائیل کو پہچان کر آٹو گراف لیتے یا پھر کلب میں اس کا تعارف رائیل کے شوہر کی حیثیت سے کرایا جاتا تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا۔ جس معاشرے میں شادی کے بعد عورت کے نام کے ساتھ فوراً اس کے شوہر کا نام آ جاتا ہو تو مردوں کو یہ ہی اچھا لگتا ہے کہ بیوی اب 'ملکیت' ہے یا پھر غیر شعوری طور پر مرد کو اپنے ہی نام سے پیار ہوتا ہے جسے اپنے نام کے علاوہ بیوی کے نام کے حصے کے طور پر بھی دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ وہاں اس کے لئے یہ بات نا قابل برداشت تھی کہ وہ بیوی کے حوالے سے پہچانا جائے۔

دوسری طرف وہ مسئلہ بھی تھا کہ لوگ جب کسی لڑکی سے لفٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور وہ انہیں گھاس نہ ڈالے تو پھر وہ ان سے جھوٹی کہانیاں منسوب کرنے لگتے ہیں ایسے ہی کچھ لوگوں نے آصف تک بھی الٹی سیدھی

باتیں پہنچائیں تو پھر گھر میں جھگڑے ہونے لگے۔ رائیل اسے بڑے آرام اور پیار سے سمجھاتی۔

”آصف! آپ کو تو مجھ پر اعتبار ہونا چاہیے کیونکہ ہمارا رشتہ تو بہت مضبوط اور قریبی ہے میں تو سارا دن آپ کے سامنے ہوں مگر آپ کو صرف سنی سنائی باتوں پر اعتبار ہے۔ لوگ تو کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتے۔ بات صرف یہ ہے کہ میں آرٹسٹ ہوں اور میری پہچان ہے ورنہ لوگ تو کسی عورت کو بھی نہیں بخشتے۔ لوگ تو کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں کے لئے بھی الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔“

وہ اکثر بات سمجھ بھی جاتا اور کچھ دن ٹھیک رہتا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ فطرتاً شکی مزاج شخص تھا۔ پھر باپ کے سائے سے تو بہت عرصہ پہلے محروم تھا اب کچھ دن پہلے ماں بھی چل بسی تھی۔ اب اس کے خاندان میں کوئی بزرگ نہ تھا جو اسے سمجھاتا۔

آصف کو اس کی جاب کرنا بھی پسند نہیں تھی۔ مگر باہا کی وفات کے بعد اور بہنوں کی شادیوں کے بعد وہ اتنی ڈپریشن ہو گئی کہ خود کو مصروف رکھنے کے لئے اس نے جاب کر لی جو دیے بھی اس کی فیلڈ کی تھی۔ پھر اسے رائیل کا کارلے کرا کیلے آنا جانا بھی پسند نہیں تھا۔ بس پھر وہ روز کسی نا کسی بات کا بہانہ بنا کر اس سے جھگڑا کرتا۔ وہ اس کے کردار پر کچھ اچھا لٹا اور وہ اپنے کردار کے بارے میں صفائیان دیتی دیتی تھک جاتی تھی۔ اب اس کا تخلیقی ذہن تو نجانے کہاں گیا۔ شادی کے بعد کوئی ایک بھی ڈھنگ کی پینٹنگ نہ بن پائی تھی۔ بناتی بھی کیسے؟ وہ ہر وقت اس قدر ذہنی اذیت میں رہتی کہ Creative کام کے لئے کیا سوچتی؟ اتفاق سے وہ رنگ برش اور لکھوس لے کر کچھ بنانے کے لئے بیٹھتی تو آصف کا موڈ بگڑ جاتا اور وہ اسے کسی نا کسی کام کا کہہ کر مصروف کر دیتا۔ رائیل کو لگتا تھا کہ یہ شادی اس کے لئے ایسی سزا تھی جو نہ تو اسے جینے دیتی اور نہ ہی مرنے دیتی تھی امی کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا کہ اس کا انتخاب غلط تھا۔ آصف تو کسی بھی طرح رائیل کے لائق تھا ہی نہیں۔ اس سے تو اس کی شادی نہ ہونا ہی بہتر تھا۔ وہ محسوم اس کے غلط فیصلے کی سزا بھگت رہی تھی۔ یہ سوچ کر وہ بہت دکھی رہتیں۔

ایک سال بعد جب شان پیدا ہوا تو رائیل کو خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا کہ اولاد کے بعد اب شاید آصف میں بھی تبدیلی آئے۔ مگر وہ تو عجیب ذہنی مریض تھا۔ گھروں میں لڑائیاں کسی وجہ سے ہوتی ہیں مگر وہ تو بنا کسی قصور کے اپنے لفظوں کے تیروں سے اس کا نازک سادل چھید کر رکھ دیتا تھا۔ دراصل وہ رائیل

کے مقابلے میں شدید احساس کمتری کا شکار ہو جاتا تھا۔ پھر شکی مزاج اور تنگ نظر بھی تھا اس لئے معمولی معمولی باتوں کو ایشو بنا لیتا تھا۔ رائیل فون پر بات کر رہی ہوتی تو وہ شک میں پڑ جاتا یونیورسٹی سے دیر سے آتی تو سوالات کی بوچھاڑ ہوتی۔ کوئی آرٹ کی exhibition دیکھنے جاتی تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا۔۔۔۔۔ سلسلہ یونہی چلتا رہا کہ ایک دن تو اس نے غصے میں آ کر اس کے پاکیزہ کردار پر حملہ کیا تو رائیل بھی جواب میں چیخ پڑی تھی تو آصف نے اس کے منہ پر ایک زوردار چانتا دے مارا تو رائیل جیسے سن ہو کر رہ گئی۔ اس کی پرورش جس گھر میں ہوئی تھی وہاں مرد عورتوں پر کبھی بھی اس طرح نہیں چیختے تھے وہ تو بابا کی دلاری اور بھائیوں کی لاڈلی تھی۔۔۔۔۔ اس پر آصف نے غلیظ الزام لگایا اور ہاتھ بھی اٹھایا۔۔۔۔۔؟؟؟

”بس۔۔۔۔۔ اب نہیں ہے مجھ میں برداشت۔۔۔۔۔“

وہ شادی کے بعد اس ماحول میں جیسے نفسیاتی مریضہ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ بے اختیار باہر دوڑی۔۔۔۔۔ گیراج میں آ کر اپنی کار میں بیٹھی اور تیزی سے اسٹارٹ کرتی سڑک پر آ گئی۔

”امی۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ امی!۔۔۔۔۔ میں اب برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔“

وہ روتی بھی جا رہی تھی اس لئے آنسوؤں کی وجہ سے بار بار اس کی آنکھوں کے آگے دھند سی آ جاتی۔ پھر اچانک سے ایک موٹر کو کاٹتے ہوئے تیزی سے آتے ہوئے ٹرک سے بچنے کی خاطر اس نے اسٹیرنگ کا رخ موڑا مگر اسپید کی وجہ سے کار کنٹرول سے نکل گئی اور ایک تار و درخت سے زور سے ٹکرائی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

اس کا شدید ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ مہینوں اسپتال میں زیر علاج رہی۔ جب وہ اسپتال سے فارغ ہوئی تو امی اور بھائی اسے اپنے گھر لے جانے لگے تو اس نے پوچھا۔

”امی!۔۔۔۔۔ میرا بچہ کہاں رہا اتنے دن؟“

تب یہ خبر پھر بجلی بن کر اس کے حواسوں پر گری کہ اس دوران نہ صرف یہ کہ آصف اسے طلاق نامہ بھجوا چکا تھا مگر وہ شان کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ اسے بہت ڈھونڈا گیا مگر کچھ اتا پتا نہ چلا۔ رائیل کی تو جیسے دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ اسے شک تھا کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہوگا کیونکہ وہ کچھ عرصے سے اسی کوششوں میں تھا۔ امی سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اس کے دکھ میں ہارٹ پیسٹ بن گئیں اور ایک دن وہ بھی رائیل کو چھوڑ



گئیں اچانک ہارٹ اٹیک کے بعد۔۔۔ ان کی وصیت کے مطابق گھر راتیل کو دیا گیا۔ بھائی بھی الگ ہو کر سیٹل ہو گئے تھے۔ اب وہ تھی اور یہ گھر تھا۔ اس کی بیوہ پچھو، گھاں، بابا پیر وادرفشن وہ ہر طرح سے آصف کے بارے میں معلومات کرواتی رہی کیونکہ اسے اپنا بچہ چاہئے تھا۔ اس کے علاوہ اب اس کا کون تھا۔ اس کی متاثرہ رہی تھی اپنے بچے کے لئے۔ اسے پتہ چلا کہ آصف بچے سمیت امریکہ چلا گیا تھا اور شاید نیویارک میں تھا۔ وہ اس سے بہت دور تھا وہ کیسے اسے واپس لائے۔

راتیل نے اپنی کہانی فیضان کو سنادی۔ یہ سب کچھ سن کر وہ بھی بہت دکھی ہو گیا پھر بہت دھیرج سے کہنے لگا ”راتیل! میں آپ کے دکھ اور اذیت کو دل سے محسوس کر سکتا ہوں۔ آپ جیسی talented اور پیاری لڑکی کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ وہ شخص کسی بھی لحاظ سے آپ کے قابل نہیں تھا۔ مگر اب جو ہو چکا سو ہو چکا۔ گذرا وقت تو واپس نہیں لایا جاسکتا۔ آپ کو اب نئے سرے سے اپنی زندگی شروع کرنی ہے۔ آپ تو آرٹسٹ ہیں تخلیق کار ہیں۔ آپ اپنے دکھ کی وجہ سے آس پاس کے لوگوں کے دکھوں کو شاید بھول گئی ہیں۔ آپ کو اپنی ذات کے خول سے نکلنا ہوگا۔ ذرا آس پاس تو دیکھیں کے لوگ کتنی تکلیف میں ہیں۔۔۔ کتنے ظلم برداشت کرتے ہیں۔ زندگی کتنی تنگ ہے ان پر۔۔۔ آپ کو ان کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔“

”میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟ میری حیثیت ہی کیا ہے؟“

”یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ نے خود کو پہچانا ہی نہیں ہے۔ آپ تو بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تخلیق ذہن اور طاقتور فن عطا کیا ہے۔ کیا ہر کسی کو ایسا کچھ ملتا ہے؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ کیا اس سے آپ کو اندازہ نہیں ہوا کہ قدرت آپ سے کوئی خاص کام لینا چاہتی ہے؟“

”کون سا کام؟“ وہ حیران ہو کر بولی۔

”آپ کو سب سے پہلے اپنے خول سے باہر نکلنا ہوگا پھر دیکھیں کہ دنیا میں کتنے دکھ ہیں۔ غربت و افلاس ہے، ظلم و جبر ہے، نا انصافیاں ہیں، غلط ریتیں اور رکیمیں ہیں، یہ دائرہ پھر بڑھتا ہے۔ ہمارا سماج، پھر ملک پھر دنیا۔۔۔ یہ ہر روز خود کش حملے، یہ مختلف مافیاز، یہ مذہب کے نام پر جنونیت، ایک دوسرے کا استعمال لوگوں کو پینے کے لئے صاف پانی میسر نہیں، تھر میں بھوک سے بلک بچے مر رہے ہیں۔۔۔ ایک طرف جدید ٹیکنالوجی اور

مرغ تک جانے کی جستجو مگر ہمارے پاس پانی، روٹی اور بجلی کے لئے لوگ پریشان۔۔۔ لوگوں کہ درد کو محسوس کریں اور یہ کنکوس پر اتاریں۔ لوگوں کے ذہنوں کو اپنے فن سے جھنجھوڑیں۔ ہم ادیب اور آپ فنکار تو بہت طاقتور لوگ ہیں۔ کیونکہ ہم سوچ سکتے ہیں اور اس سوچ کو لفظوں اور رنگوں میں ڈھال سکتے ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے قلم اور برش کی حرمت رکھیں اور ان کا مثبت استعمال کریں۔ آئیں مل کر ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں، دکھی لوگوں کی اپنی حیثیت کے مطابق خدمت کریں۔ کیونکہ رب لوگوں کے دلوں میں رہتا ہے۔ یہی روحانیت کا رستہ ہے۔۔۔ یہی سکون کی راہ ہے۔“

وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھا تا رہا اور اس کے دل پر اس کے الفاظ بہت اثر کر رہے تھے۔ آج سے پہلے کسی نے اسے سمجھایا بھی تو نہ تھا مگر وہ اب بھی مایوس تھی اس نے کہا۔۔۔

”میں ایک کمزور تنہا عورت کسی کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟“

”یہی تو آپ کی بھول ہے راتیل! نہ آپ تنہا ہیں نہ ہی کمزور۔ آپ بس یاسیت کا شکار ہو گئی ہیں آپ زندگی کے تاریک پہلو کو دیکھنے کی عادی ہو گئی ہیں۔ آپ روشن پہلو کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔

اچھا۔۔۔۔۔ سب سے پہلے آپ یہ کریں کہ فطرت کو دیکھیں۔ قدرتی نظاروں کے حسن کو محسوس کریں پھر ان کو Paint کریں۔ جب آپ پھولوں کو، تلیوں کو، حسین چہروں کو اور مسکراتے ہوئے بچوں کو پینٹ کریں گی تو آپ کو اپنے اندر خود بخود ایک خوبصورت تبدیلی محسوس ہوگی۔ آپ کے اندر اعتماد آئے گا۔ آپ یہ سب کریں گی ناں؟“

”کوشش کروں گی۔“ راتیل نے کہا

”گڈ! اور عید کے ان دنوں کو رو کر برباد نہیں کریں گی۔ اللہ پر چھوڑ دیں سب کچھ۔ انشاء اللہ مستقبل میں بہتری آئے گی۔“

اس کی باتیں سن کر اسے بہت حوصلہ ہوا اور دل کا غبار بھی ہلکا ہو چکا تھا۔

”اب میں ہوں ناں!۔۔۔ جب بھی پریشان ہوں، یا کوئی بھی کام ہو تو بلا جھجک مجھ سے رابطہ کیجئے گا۔“ فیضان نے کہا۔



”جی، آپ فیضان بات کر رہے ہیں۔“ رائیل نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی شرارت کے موڈ میں آ گیا۔۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ اب مجھے بتانا نہیں پڑے گا کیونکہ اب آپ میری آواز پہچاننے لگی ہیں۔“

”جب میں نے عید کے دوسرے دن کال کی تھی اور آپ نیند سے اٹھے تھے اور میں نے ”ہیلو“ کہہ کر کال ختم کر دی تھی تب آپ نے بھی تو صرف ”ہیلو“ سے ہی میری آواز پہچان کر ریگ بیک کی تھی تو پھر میں آپ کہ آواز اب کیسے نہیں پہچان سکتی کہ روز ہی بات کرتے ہیں۔“

”آپ نے paintings بنا شروع کر دی ہیں ناں دوبارہ۔“

”ہاں۔۔۔۔ اور اس کا سہرا بھی آپ کے سر ہے کہ آپ دوبارہ میرے اندر والی وہ پہلے والی رائیل کو کھینچ کر نکال لائے۔ ورنہ میں تو ڈپریشن کی مریضہ بن چکی تھی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گئی تھی۔“

”قدرت موقعے دیتی ہے اسے اپنے آپ کو پہچانیں wish you best of luck۔“

رائیل فیضان کو پا کر خوش تو تھی مگر یہ بھی سوچتی کہ آخر وہ کب تک اور کس تعلق سے فیضان کے ساتھ چل سکتی ہے۔ ان کو ملے اب ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو چکا تھا مگر اس کا رویہ اس پر واضح نہیں تھا۔ ایک دن اس نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

”آپ آخر میرا تا خیال کیوں رکھتے ہیں آپ مجھ سے روز ہی بات بھی کرتے ہیں۔“

”کیا میں نے کبھی کوئی ایسی بات کی جو نا پسندیدہ ہو آپ کے لئے۔ کیا آج تک میں نے وہ کچھ کہا ہے جو ننانوے فیصد مرد عورتوں کو کہتے ہیں؟“

”کہا تو بے شک نہیں ہے مگر اپنے رویے سے بہت کچھ محسوس تو کرایا ہے کہ میں آپ کے لئے بہت اہم ہوں۔ اس لئے آج میں جاننا چاہتی ہوں کہ میں آپ کے لئے کیا ہوں؟“

”رائیل! میں اس تعلق کو دوستی کا نام نہیں دوں گا۔ کیوں کہ جس سوسائٹی سے ہمارا تعلق ہے، وہاں عورت اور مرد کی دوستی کا کوئی تصور نہیں کیونکہ کتنا بھی براڈ ماسنڈڈ مرد کیوں نہ ہوں وہ عورت سے اپنا تعلق اس کے

دوست کی حیثیت سے نہیں کرا سکتا۔۔۔۔ یہ سب کتابی اور فلمی باتیں ہیں۔“

”پھر۔۔۔۔ یہ کیسا تعلق ہے ہمارے درمیان؟“



”زندگی میں رونما ہونے والے واقعات وحالات بعض اوقات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتے بلکہ ہو جاتے ہیں لوگ ایک دوسرے سے اسی طرح مل جاتے ہیں۔“

”پھر۔۔۔ بھی۔۔۔ ہمارے ذہن میں کلیئر ہونا چاہیے کہ ہمارا تعلق کیسا ہے۔ کیونکہ بہت سی باتیں اور رویے تب ہی واضح کیے جاسکتے ہیں جب تعلقات کا تعین ہو۔“

”کیا ضرورت ہے ہمارے تعلق کو کوئی نام دینے کی؟ یہی تو اس کی خوبصورتی ہے۔ اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے ایسے سفر پر لے جا رہے ہیں جس کی منزل کا کچھ بھی اتنا پتا نہیں ہے؟“

”آپ اس سفر پر میرے ساتھ چلیں تو سہی“

”کہیں ہم قدم قدم پر ہرٹ نہ ہوں“

”میں آپ کو ہرٹ نہیں ہونے دوں گا۔“

”آپ ایسا سوچ سکتے ہیں کیونکہ آپ مرد ہیں۔ مگر مجھ سے تو لوگ پوچھیں گے۔ میں کیا جواب دوں گی؟۔۔۔ پھر میرا مستقبل کیا ہوگا؟“

”اس کا فیصلہ ہم وقت پر چھوڑ دیتے ہیں۔ انشاء اللہ کچھ بہتر ہی ہوگا۔“

”میں چاہتی ہوں کہ آپ واضح کریں پہلے۔“

فیضان نے ایک دم تیز لہجے میں کہا۔۔۔

”رائیل!۔۔۔ رائیل!۔۔۔ میں زبان سے کیا کہوں؟ تم کیا سننا چاہتی ہو۔۔۔ تم مجھے سمجھتی ہو۔“

”مگر۔۔۔ میرے دل میں اندیشے ہیں۔ آپ کے بارے میں سنی ہوئی باتیں۔۔۔“

فیضان نے شدید غصے سے کہا۔۔۔

”میرے خیال سے اب مجھے فون بند کر دینا چاہیے۔“

”آپ تو ناراض ہی ہو گئے۔“

”جب تم ایسی باتیں کرتی ہو تو مجھے بہت ہی تکلیف ہوتی ہے۔ تم تو آرٹسٹ ہو۔ تمہاری سوچ اور نظر

میں وسعت ہونی چاہئے۔ اتنا عرصہ ایک دوسرے سے بات کرنے کے بعد بھی تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔۔۔ جب کہ ہم 'آپ' سے 'تم' تک پہنچ چکے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ پھر آج فیصلہ کر لو کہ میں جیسا بھی ہوں تمہیں قبول ہوں یا نہیں؟“

رائیل اس پھویشن کے لئے پرگز تیار نہیں تھی۔ وہ گڑبڑا گئی۔

”مگر۔۔۔ آپ کیوں دلچسپی لیتے ہیں اس قدر مجھ میں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ یہ جو تمہارے چہرے پر ہر وقت خزاں چھائی رہتی ہے وہ بہار میں بدل جائے۔ اپنی زندگی جیو۔ خود کو ختم مت کرو۔ کسی کا نقصان نہیں ہوگا اس سے سوائے تمہارے اپنے۔“

”مسئلہ یہی تو ہے کہ لوگوں کی منافقتیں دیکھنے کے بعد میں نے سب کچھ چھوڑ کر خود کو گناہی میں گم کر دیا۔۔۔ میں اپنی زندگی میں سکون کی تلاش میں تھی مگر تم نے آکر سب گڑبڑ کر دیا۔“

”اوہ! تو میری وجہ سے تمہاری زندگی ڈسٹرب ہوئی ہے۔۔۔“ وہ بڑے دکھ سے بولا۔۔۔

”ٹھیک ہے۔ اب میں تمہیں کال کر کے ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ لیکن تمہیں اپنی زبان سے خود مجھے منع کرنا ہوگا۔“ رائیل چپ ہو گئی تو تھوڑے وقفے کے بعد وہ بولا۔۔۔ ”کیوں خود کو دھوکہ دیتی ہو۔ یا تو اعتراف کرو کہ تمہیں میری ضرورت ہے یا پھر بات کرنے سے منع کر دو۔“

”مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں کیا چاہتی ہوں۔“

”میں تمہیں وقت دیتا ہوں۔ اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرنا کہ واپس گناہی کے اندھیرے میں جا کر رہنا ہے اور دنیا سے ڈر کر ایک کونے میں دبک کر خود کو محفوظ سمجھنا ہے یا پھر ایک نئے زندگی شروع کرنی ہے؟“

یہ کہہ کر فیضان نے کال ڈسکنیکٹ کر دی اور رائیل حیران و پریشان رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

”زارا! بیٹی یہ قائل لو اور اسے سنبھال کر رکھو۔“

زارا کے والد نے اچانک رات کو اسے کمرے میں بلایا وہاں اس کی امی بھی موجود تھیں جو ان کے پلنگ کے برابر میں کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔

”یہ کیا ہے بابا جانی؟“ زارا نے حیران ہو کر پوچھا۔

انہوں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا کر بیٹھایا اور اسے فائل دیتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! میری نظر میں بیٹیوں اور بیٹوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میری زمینوں میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ میں نہیں چاہتا۔۔۔ کہ۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ میرے بعد جائیداد کے بٹوارے میں کوئی مسئلہ ہو اس لئے ابھی سے فیصلے کئے جا رہا ہوں۔“

یہ سن کر وہ تڑپ اٹھی اور کہا۔

”اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو۔ پھر آپ نے تو مجھے سبھی کچھ دے دیا۔ اچھی تعلیم و تربیت، اعتماد اور محبت۔ پھر میرے گھر کی تعمیر میں بھی تو مدد کی۔ میں جاب کرتی ہوں۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔ اور مجھے کیا چاہئے؟“

”بیٹا! جو تمہارا حق بنتا ہے وہ تو دوں گا۔“

”آپ جیسے والدین کا سایہ میرے سر پر ہو میرے لئے یہی کافی ہے۔“

”میرے بعد لیگل معاملات میں کوئی بھی مسئلہ ہو تو میرے لیگل ایڈوائزر فیاض احمد سے رابطہ کرنا۔“

انہوں نے فائل اور کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔

☆.....☆.....☆

بہت دنوں کے بعد فیضان نے کال کی تو اس نے بے اختیار شکایت کی۔

”آپ نے اتنے دن بعد کال کی ہے۔ کہاں رہا اتنا عرصہ؟“

”کہیں نہیں بھی۔ یہیں تھا۔ اپنے ادبی پرچے کے دوسرے ایڈیشن کے سلسلے میں بہت مصروف رہا اور تم کیسی ہو؟“

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“

”مجھے امید ہے کہ اب تم اپنے ڈپریشن کے فیرے نکل آئی ہو گی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ شاید۔“

”شاید نہیں یقیناً۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔ کوئی ضرورت نہیں یہ دوائیں وغیرہ لینے کی آج میں نے اس لئے کال

کی ہے کہ ایک دفعہ تم نے ذکر کیا تھا کہ تم بھی انگریزی اخبار اور رسالوں میں آرٹ کے حوالے سے مضمون اور رپورٹس لکھا کرتی تھیں۔“

”ہاں۔۔۔ تھی کسی دور میں بہت اکیٹو۔“

”تو پھر سے اکیٹو بنو۔ ٹائم نکالو اور میرے آفس آؤں میں اس سلسلے میں تم سے کچھ باتیں ڈسکس کرنا چاہتا ہوں۔ کب آؤ گی؟“

”آج کل طبیعت کچھ سیٹ نہیں ہے۔ طبیعت تھوڑی سیٹ ہو جائے تو آؤں گی۔“

”تمہاری طبیعت خود تم سے بیزار ہے۔“

فیضان نے اس طرح سے برکتہ کہا کہ رائیل کو بے اختیار ہنسی آگئی اور فیضان کو لگا کہ اس کے کانوں میں جیسے جلتنگ بج اٹھا ہو وہ پھر بولا۔

”ارے! مجھے اس بات کا خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔۔۔؟“

”کیا؟“ رائیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیوں نہ آرٹ سیکشن کا انچارج ہی تمہیں بنایا جائے۔ تمہیں اب دوبارہ اپنی فیلڈ میں بھرپور طریقے سے آنا چاہئے۔ اس طرح کہ سب کو حیران کر دو۔“

”وقت وقت کی بات ہے۔ اب نہ وہ پہلے سا وقت اور حالات ہیں نہ ہی وہ نوجوان لڑکی رائیل ہے۔ اب تو میں شاید ڈپریشن کی مریضہ بن چکی ہوں۔“

”تم نے ہی تو بتایا تھا کہ تمہارا ڈاکٹر یہی کہتا ہے کہ اب تمہیں دواؤں سے زیادہ اپنے اندر مثبت تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ اور وہ تب ہی ممکن ہے جب تم اپنے اس خود ساختہ خول کو توڑو۔ دوبارہ دنیا کو فیس کرو۔ سرگرمیوں میں حصہ لو۔ آرٹ کی دنیا کو جوائن کرو۔ پھر کب آؤ گی؟“

”میں کچھ دنوں میں آنے کی کوشش کروں گی۔“

”او کے مجھے انتظار رہے گا۔“ فیضان نے کہہ کر کال ختم کی۔ رائیل نے بھی اب سنجیدگی سے اس کی باتوں پر سوچنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کسی نے کوشش بھی تو نہیں کی تھی اسے زندگی کی طرف لانے کی۔ کرتا بھی کون



ایک بھائی فیملی سمیت ملک سے باہر اور دوسرا دوسرے شہر میں۔ شادی شدہ بہنیں اپنی فیملی، سسرال اور بچوں میں مگن۔ دوستی وہ کسی سے کرتی ہی نہیں تھی۔۔۔ زندگی ایسے تو نہیں گزرے گی۔ اسے اپنی زندگی جینی ہوگی۔۔۔

☆.....☆.....☆

دوسرے ہارٹ اٹیک سے زارا کے والد جانبر نہ ہو سکے۔ زارا کو یوں لگا جیسے زندگی کی تیز دھوپ میں ٹھنڈی چھاؤں دینے والی ہستی چلی گئی ہو۔ ابھی وہ اور اس کی ماں اس صدمے سے نکلے ہی نہیں تھے کہ بھائی اور بھابھی کے رویے بدلنے لگے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ وہ اپنی زمین سے کچھ حصہ زارا کے نام کر گئے تھے۔ اور پھر۔۔۔۔۔ بھابھی نے بھائی کے کان میں یہ بات ڈالنی شروع کی کہ زارا کی شادی اس کے بے روزگار اور بگڑے ہوئے بھائی سے کر دی جائے تاکہ یہ زمین کہیں اور جانے کے بجائے انہی کے پاس رہے۔ اس کے بھائی کے رشتے کو تقریباً تمام بیٹیوں والے ٹھکرا چکے تھے۔

”بہو! کچھ تو سوچا ہوتا یہ بات کرتے۔ میری بیٹی کا جوڑ ہے تمہارے بھائی سے۔ تعلیم میں اس سے کم۔ نوکری اس کے پاس نہیں وہ ایک نامور لکھاری ہے۔ دونوں کا بھلا کیا جوڑ؟“

”لکھاری ہوگی اپنے لئے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں جاتی ہے کیسے لوگوں سے ملتی ہے۔ لوگ کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں اور۔۔۔۔۔ پھر برادری سے باہر تو شادی کرنی نہیں ہے۔ کون سے انجھیر، ڈاکڑ یا لیکچر کا رشتہ آگیا اب تک؟ اس عمر کے بعد تو آنا بھی نہیں ہے۔“

اپنی بہو کی دل جلانے والی باتیں سن کر وہ چپ ہو گئیں۔ شوہر زندہ تھے تو بیٹے اور بہو کی مجال نہیں تھی کہ ایسا سوچتے یا کہتے۔

جب زارا کا بنگلہ بن کر تیار ہو گیا تو اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ نیچے کا پورشن اپنے ایک دور پرے کے رشتہ داروں کو کرائے پر دے دیا اور ماں کو لے کر اوپری منزل کے پورشن میں شفٹ ہو گئی جو دو بیڈرومز، ایک لاونج کچن اور چھوٹے سے صحن نمائیرس پر مشتمل تھا۔ اپنے والد کے لیگل ایڈوائزر سے مل کر ان کی مدد سے زمین لیز پر دے دی جس کی سالانہ آمدنی آ جاتی تھی۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس کے والد نے اس کے لئے کیوں ایسا فیصلہ کیا تھا۔ بھابھی تو یہ چاہتی تھیں کہ یہ زمین اس کے بھائی کے ہاتھ آ جائے۔ وہ اپنے والد کی زمین نہ سنبھال

پایا۔ کب کی بیچ کر کھا گیا۔

نیچے کے پورشن میں ان کے دور کے رشتے دار تھے بزرگ جوڑا جنہیں وہ لوگ شروع سے تایا جی اور تائی جی کہتے تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ان کا بیٹا اور بہو ایک روڈ ایکسٹنٹ میں اللہ کو پیارے ہو گئے ان کے بیٹے اور بیٹی پر کرم کیا جو کچھ زخمی ہوئے۔ اب وہ دونوں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اسلم میٹرک میں پڑھتا تھا اور سائرہ آٹھویں میں۔ تایا ابا کی پنشن سے رقم آجاتی تھی اور ان کے مرحول بیٹے کی لائف انشورنس کی رقم سے انہوں نے ایک جنرل اسٹور خرید لیا۔ اس طرح سے ان کا خرچہ چلتا تھا۔ زارا نے ان کی مدد کی خاطر ہی برائے نام کرائے پر فچلا پورشن ان کو دے دیا۔ کیونکہ تایا جی اتنے غیور تھے کہ بغیر کرائے کے وہاں نہ رہتے۔ ان کے ساتھ پرانی خاندانی بوا بھی تھیں۔

تایا جی خود ہر روز چند کھٹے اپنے اسٹور پر گزارتے۔ بہت ہی اچھے لوگ تھے۔ زارا کو اطمینان تھا کہ جب تک وہ کالج میں ہوتی یا کہیں باہر تو امی کے پاس تائی جی ہوتیں۔ کبھی وہ اوپر آ جاتیں کبھی امی ان کے پاس نیچے چلی جاتیں۔ وہاں بچوں کی وجہ سے رونق بھی لگی رہتی۔ اسلم اور سائرہ اسے ”زارا آپی“ کہتے۔ زارا کا بھائی کبھی کبھار آکرامی سے مل لیتا۔ بھابھی تو کبھی نہیں آئی نہ کبھی بچوں کو چھوڑا۔

☆.....☆.....☆

کچھ دن گزرے کہ رائٹل کو ایک شام یہ خیال آیا کہ کیونکہ آج وہ اچانک سے فیضان کے آفس میں پہنچ کر اسے سر پرانزدے۔ آج کل اسے بار بار چکر آنے لگے تھے۔ ڈاکٹر سے کنسلٹ کیا تو تمام ٹیسٹ لینے کے بعد اس نے کہا کہ اسے کوئی بھی مسئلہ نہیں ہے۔ بس وہ ڈپریشن میں مبتلا ہے۔ دوائیاں دینے کے علاوہ اس نے اسے خاص طور پر سمجھایا تھا کہ وہ اپنا لائف اسٹائل بھی بدلے اور خود کو مثبت کاموں میں مصروف رکھے اور اب ڈپریشن کا علاج بھی سنجیدگی سے کرائے اور باقاعدہ چیک اپ کروائے اور دوائیاں بھی باقاعدگی سے لے۔ اس نے یہی سوچا کہ وہ تھوڑا سا تبدیل کرے روٹین کو۔ یہ سوچ کر وہ تیار ہوئی اور بہت عرصے کے بعد ہلکا سا میک اپ کیا اور جائزہ لیا اور خود کو اپنا آپ فریش لگا۔ لیکن جیسے ہی وہ ہینڈ بیگ اٹھا کر کھڑی ہوئی تو اس قدر زور سے چکر آیا اور دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ ڈپریشن کا علاج وقت لے گا اور اگر اس نے اب کی بار اپنے

علاج کو بنجیدگی سے نہ لیا تو اس کی طبیعت مزید خراب ہو سکتی ہے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دل چاہا کہ چیخ کر روئے۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوگی۔

ٹھیک اسی وقت موبائل کی رنگ بج اٹھی اس نے دیکھا کہ فیضان کی کال تھی۔ وہ حیران ہو گئی کہ ٹھیک اسی وقت اس کی کال آرہی تھی جب اس نے اسے یاد کیا تھا۔ اس نے کال اٹینڈ کی دعا سلام کے بعد اس نے حسب روایت پوچھا۔

”اور سنائیں۔۔۔ کیا حال چال ہیں؟“

”حال تو ٹھیک نہیں۔“ وہ بولی۔

”کیوں بھئی؟ خیر تو ہے؟ کیا ہوا؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے میں نے سوچا تھا کہ آپ کے آفس میں آ کر آپ کو سر پرانزدوں۔۔۔ تیار ہو کر آ ہی رہی تھی کہ طبیعت خراب ہو گئی ہے۔“

”کچھ نہیں ہوا ہے تمہیں۔ یقین کرو۔ آ جاؤ فوراً۔“

”نہیں فیضان! مجھ میں جیسے دو چار قدم اٹھانے کی بھی سکت نہیں ہے۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔“

”تم قدم اٹھاؤ تو سہی۔ دیکھنا کچھ نہیں ہوگا۔ محض تمہارا وہم ہے۔“

”اگر وہم ہوتا تو ڈاکٹر نے جو دوائیں دیں ہیں وہ شاید تفریحاً کھاتی ہوں میں۔“ اس نے چڑ کر کہا۔۔۔

”اچھا بھئی ٹھیک ہے۔ مگر اب نکلو اس کمزوری سے آ جاؤ شاباش۔“ وہ اسے بچوں کی طرح پکارتا رہا تھا۔

”نہیں فیضان! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کہیں گر نہ جاؤں۔“

”میں تمہیں گرنے نہیں دوں گا۔ سنبھال لوں گا۔“ فیضان کے لہجے میں ایک اپنا پن تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ آج نہیں۔۔۔۔۔“

”اچھا پھر ایسا کرو کہ تھوڑی دیر لیٹ جاؤ۔ ضرورت ہو تو دوا لے لو اور پھر دیکھنا کہ تم خود کو بہت بہتر محسوس کرو

گی۔ پھر مجھے بتانا۔“





فیضان سے بات کر کے۔ پھر سوچا۔

میں نے تو اپنے دل کا دروازہ مضبوطی سے بند رکھا تھا۔۔۔ ہر کھڑکی کو۔۔۔  
ہر روشندان کو۔۔۔

یہاں تک کہ میں نے کوئی معمولی سی بھی درز کھلی نہیں چھوڑی تھی۔۔۔  
مگر یہ شخص تو خوشبو کی طرح ہے۔۔۔

جو کہیں نہ کہیں سے اپنا راستہ بنا لیتی ہے۔۔۔  
خوشبو کو کون روک سکتا ہے بھلا۔۔۔!!!

پیار بھی شاید ایسے ہی ہوتا ہے

بنا اجازت اور مرضی کے

کسی کے بھی دل میں اتر جاتا ہے

کیسے روکوں اس کو؟

کیسے روکوں خود کو؟

یہ شخص تو

بس

میرے وجود میں بستا جا رہا ہے

خوشبو کی طرح

جس نے مجھے۔۔۔ میرے دل کو۔۔۔

میری روح کو

گھیر لیا ہے

اور میرے سارے وجود کو مہکا دیا ہے۔

☆.....☆.....☆

والد کی جدائی نے زارا کو زندگی کی کڑی دھوپ سے آشنا کیا کہ کچھ عرصے بعد ابھی بھی چھوڑ گئیں تو اسے اپنی زندگی ہی ادھوری لگی۔ تایا جی اور تائی جی نے اسے بہت سنبالا اور نہ وہ تو بکھر گئی ہوتی۔ ماں کی تدفین کے بعد اس کے بھائی نے اس سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ زارا نے بھی خود کو محدود کر لیا۔ آدھا دن جاب میں گزر جاتا اور باقی کا وقت لکھنے میں یا تھوڑا بہت گھر کے کاموں میں۔ صبح وہ ناشتہ خود تیار کر کے کرتی۔ دوپہر کا کھانا تائی جی بھیجتیں کہ انہیں پتہ تھا کہ وہ کالج سے تھکی ہوئی آتی ہے۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کرتی رات کو وہ اپنے لئے کوئی ہلکی پھلکی ڈش بناتی۔ ویک اینڈ ہوتا یا کوئی چھٹیاں تو زارا خود بھی شوق سے کوئی ڈش بنالتی اور نیچے لے جاتی اور سب مل کر کھاتے کبھی اسلم اور سائرہ کو آؤٹنگ پر لے جاتی۔ پھر مل کر آئس کریم کھاتے۔ ان کے سکول کی میٹنگز اور پروگرامز وہی جا کر اینڈ کرتی تاکہ انہیں ماں باپ کی کمی کا احساس نہ ہو۔

زندگی کی گاڑی اسی طرح رواں دواں تھی کہ سالوں بعد علی حیدر مل گیا۔ اب وہ اسی کے شہر میں این۔ جی۔ او کے آفس میں آگیا تھا۔ ایک ادبی پروگرام میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ بہت خوش ہوئے اتنے عرصے بعد۔ ایک دن وہ دونوں شاہد کے آفس بھی گئے۔

”بھئی ہم لڑکے تو اب بھی مل کر یونیورسٹی ڈیز کی طرح لٹری انٹنس اریج کر سکتے ہیں۔“

”یہ۔۔۔۔۔ ہم لوگ میں کون کون شامل ہیں؟“ شاہد نے پوچھا

”میں، تم، زارا، رائیل، فواد اور شاہ جی بھی!“

علی حیدر حسین سید کو ہمیشہ ’شاہ جی‘ کہا کرتا۔ زارا کے چہرے پر اس کے ذکر پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ عرصہ ہوا نہ اس نے رابطہ کیا پھر نہ ہی زارا نے۔

”رائیل تو آج کل بہت مصروف ہے، فواد صرف آرٹسٹ بن کر رہ گیا ہے۔ بالکل بھی سوشل نہیں رہا۔ دن رات اپنی سائنٹس پوری کرنے میں مصروف رہا حسین سید تو وہ کبھی کا کراچی شفٹ ہو گیا اور پھر رابطہ ہی نہیں رکھا۔ شاہد بولا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔ ابھی فواد کے پاس چلتے ہیں بہت دن ہو گئے اس سے ملے۔“

سب مل کر آرٹس کونسل میں اس کے آفس میں پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ اپنے اسٹوڈیو میں تھا۔ یہ لوگ وہاں پہنچے

وہ دنیا سے بے نیاز ایک کونے میں رکھے ایک لائف سائز sculpture پر کام کر رہا تھا۔ ہر طرف جا بجا مجسمے تھے کچھ ادھورے۔۔۔ کچھ مکمل۔ اسٹوڈیو میں رنگوں اور کیمیکل کی بو تھی اور فواد عجیب بے ترتیب حلے میں تھا۔ بال بکھرے ہوئے، آستین چڑھی ہوئی، پاؤں ننگے، جوتے ایک طرف پڑے ہوئے

”ہیلو فواد۔۔۔! یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے یا؟“

علی حیدر نے زور سے کہا تو فواد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو پھر زارا کو دیکھ کر چونک پڑا۔ پھر وہ شاہد، ندیم اور علی حیدر سے پر جوش طریقے سے ملا۔۔۔

”آپ کیسی ہیں۔۔۔ مس۔۔۔ یا مسز زارا؟“ اس نے پوچھا تو زارا کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

”ارے بھئی شاہد کے علاوہ ہم سب ابھی سنگل ہیں یہ بھی مس ہیں۔“ علی حیدر نے کہا۔

فواد ان سب کو لے کر اپنے آفس آیا۔ سب ایک دوسرے کے بارے میں پوچھنے لگے۔

”میں ادبی جریدے کا ایڈیٹر ہوں۔ شادی کر لی ہے دو بچے ہیں۔“ شاہد نے کہا

”میں کالج میں لیکچرر ہوں۔ دو کتابیں لکھ چکی ہوں اور تیسری کتاب پر کام ہو رہا ہے۔“ زارا نے کہا۔

”میں ایک چھوٹے سے گاؤں سے اپنے موہوم غریب باپ کے خوابوں کی تعبیر کو پانے کے لئے یونیورسٹی تک آیا تھا۔ پھر ماسٹرز کرنے کے بعد ایک این جی او جوائن کی اور ملک اردو بیرونی ملکوں میں پھرتا رہا پرا جیکٹس اور کنوینشنز کی خاطر۔ اب اس شہر میں ہوں۔ والد کے خوابوں کو کسی حد تک پورا کر پایا کہ ایک بھائی کو ڈاکٹر اور دوسرے کروکیل بنا پایا۔ دونوں بہنوں کی شادی کر دی۔“

”اور۔۔۔ انہی ذمہ داریوں کی وجہ سے کنوارے ہی رہ گئے۔“ شاہد نے لقمہ دیا تو وہ مسکرانے لگا۔

”میں نے فائن آرٹس میں ماسٹرز کیا میں تو باہر جا کر ابھی پڑھنا چاہتا تھا مگر میرے اوپر بھی علی حیدر کی طرح بہت ذمہ داریاں ہیں۔ اس لئے بہت سارے کمرشل پرا جیکٹس لے لئے۔ آج کل میوزیم کے لئے پرا جیکٹس ملے ہوئے ہیں اس لئے میری کوئی سوشل لائف نہیں۔ آفس ٹائم کے بعد رات دیر تک اپنے اسٹوڈیو میں کام کرتا رہتا ہوں البتہ میری شادی نہ کرنے کی وجہ میری ذمہ داریاں نہیں مگر کچھ اور ہے۔“

”وہ کیا؟“ شاہد اور علی حیدر نے ایک ساتھ کہا۔

”جس سے شادی کرنا چاہتا تھا اس لڑکی نے شادی سے انکار کر دیا۔ کسی اور سے کر ہی نہیں سکتا۔“

زارا کا چہرہ بالکل دھواں دھواں سا ہو گیا کہ وہ اس کا نام نہ لے بیٹھے۔ اچھا ہوا کہ عین ٹائم پر چڑا سی ریفریشمنٹ لے کر آ گیا اور وہ تینوں بھوکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔ زارا کو یونیورسٹی کا زمانہ یاد آ گیا۔ تب بھی وہ یہی کرتے تھے۔

☆.....☆.....☆

ایک شام رائیل فیضان کے آفس پہنچ ہی گئی۔ سردیوں کی خوبصورت شام تھی اس نے سیاہ پرنیڈ سوٹ پہنا ہوا تھا اور ہلکا میک اپ کیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس کا آنا فیضان کے لئے سر پرانز ہوگا! تھوڑی دیر تو وہ اس کے آفس کے دروازے کے باہر کھڑی رہی اور وہ بھی کچھ کنفیوز تھی۔ پھر ایک دم اندر داخل ہو گئی تو فیضان اسے دیکھتے ہی بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور حیرت زدہ لہجے میں کہا۔۔۔

”تم؟۔۔۔ یوں اچانک۔۔۔!!“

”what a pleasant surprise.....!“

اس کی خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ رائیل اس کی ٹیبل کے قریب رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ خوش بھی تھا، بے تاب بھی تھا اور کچھ نروس بھی۔ رائیل نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو دبا یا۔

”تمہیں اندازہ نہیں کے میں تمہارے آنے سے کتنا خوش ہوا ہوں۔۔۔“ اس نے کہا

”بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ تو آپ کے رویے سے ہی ظاہر ہو رہی ہے۔ سوچا کہ اچانک سے آ کر آپ کو سر پرانز دوں اسی لئے فون کر کے اطلاع نہیں دی۔“ رائیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مگر اس دن میرے اتنے کہنے کے باوجود بھی نہیں آئیں تھیں۔“ وہ بولا۔

”اس دن طبیعت بہت خراب تھی۔ بہتر تو آج بھی نہیں ہے لیکن بس ہمت کر کے نکل آئی ہوں۔“ اس کے لہجے میں بہت ادا سی تھی۔

”میں بہت بے چین رہا اس دن۔“

”چلیں! آج آگئی ہوں تو اب کچھ کام کی بات ہو جائے؟“



”کام بھی ہوتا رہے گا ابھی تو آج تک ہمارے کبھی آنے سامنے اچھی طرح ایک دوسرے کے بارے میں کوئی بات بھی نہیں ہو پائی ہے۔ آج پہلے تو میں کچھ پوچھوں گا تم سے۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ وہ حیران ہو کر بولی۔

”اس دن تم صفیہ ناز کے حوالے سے کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”میں نہیں، بلکہ وہ آپ کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں پھیلاتی ہے۔“

”کیسی باتیں؟“

”یہ۔۔۔ کہ۔۔۔ آپ نے اسے پروپوز کیا ہے۔“

”کیا۔۔۔؟۔۔۔؟۔۔۔ وہ ایک سائنکیوی لڑکی ہے۔۔۔ کیا تم اس کی بات کا یقین کرتی ہو؟“

”آپ خود ہی سوچیں کہ ایک لڑکی خود اپنی زبان سے یہ کہتی پھر رہی ہے تو میں کیا کوئی بھی یہی سچ سمجھ گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب وہ مجھے بدنام کرنا چاہتی ہے۔“ وہ اب ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”مگر۔۔۔ کیوں کر رہی ہے وہ ایسا؟“

”رائیل ادہ کسی ایسے سنیر ادیب کے ریفرنس سے میرے پاس بھیجی گئی تھی جسے میں استاد کا درجہ دیتا ہوں۔ وہ اپنے تحریروں کی اصلاح کرانے میرے پاس آئی تھی۔ پھر مجھے لگا کہ وہ مجھ میں انوالو (Involve) ہو رہی تھی جب کہ میں نے اسے قطعی کوئی رسپانس نہیں دیا تھا۔ کچھ لوگ اپنے آپ ہی دوسروں سے امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں پھر جب وہ امیدیں پوری نہیں ہوتیں تو کچھ لوگ تو خاموشی سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ اپنی نا آسودہ خواہشوں کا بدلہ لینے کے لئے دوسروں کو بدنام کرنا شروع کرتے ہیں پھر بحیثیت حساس ادیب کے میں اس کے غم و غصے کو سمجھتا بھی ہوں۔ دوسری طرف اس کا کردار بھی لوگوں کے سامنے عیاں ہے کہ وہ اسی طرح لوگوں کو استعمال کر کے آگے بڑھتی ہے پھر بھی بحیثیت خاتون میں ان کا احترام کرتا ہوں۔“

اس نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں کہا تو وہ بولی۔

”آپ کا شمار کس قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے؟“

”ذکر صفیہ ناز کا تھا میرا نہیں۔ اب دوسری بات ہو جائے۔“

”کوئی؟“

”تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“

”پلیز فیضان صاحب! مجھے اس موضوع سے ہی چڑ ہے۔“

وہ غصے سے بولی تو وہ اسے تنگ کرتے ہوئے بولا۔

”تمہیں کس بات سے چڑ نہیں؟ تم نے کبھی غور کیا ہے کہ تم کتنی چڑ چڑی بلکہ تک چڑی ہو چکی ہو؟“

رائیل کو ہنسی آگئی وہ بولا۔

”کوئی آئیڈیل وغیرہ کا چکر ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لیں۔“ وہ بولی۔

”کون سی خوبیاں ہونی چاہئیں موصوف میں؟“

”جو عورت کو انسان سمجھے اور یہ سمجھے سکے کہ اس کی بھی کوئی سوچ ہے، مرضی ہے اور شخصیت ہے۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ کچھ لمحے ٹھہر کر بولا۔

”میرے بارے میں آپ کے شکوک و شبہات ختم ہوئے یا نہیں؟“

وہ شرمندہ ہو گئی اور کچھ کہہ نہ سکی کہ اس نے ایک دم دوسرا سوال دے دیا۔

”میں آپ کو کیسا لگتا ہوں؟“

رائیل اس سوال کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے پریشان ہو گئی۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”سچ بولنے کی ہمت پیدا کرو رائیل۔“

”کیا مطلب؟“

”میں تمہیں پسند ہوں؟“

وہ بری طرح نروس ہو گئی اور سر جھکا لیا وہ پھر بولا۔

”جواب دو۔“

”ہاں۔“ وہ بولی تو فیضان اپنی مسکراہٹ کو نہ دبا سکا۔ وہ اس وقت پینتیس سالہ اور شادی کے ناکام تجربے والی عورت نہیں بڑی معصوم سی لڑکی لگ رہی تھی جسے ابھی تک کوئی مرد **discover** نہیں کر سکا تھا اور جسے آج فیضان کھوج کر نکال لایا تھا۔

”اب میں چلوں؟“ وہ ایکدم بولی تو اس نے کہا۔

”ابھی تو آئی ہو اور جانے کی بات کر رہی ہو؟“

”آج تو میں ایسے ہی آئی تھی۔ کل جلدی آؤں گی پھر کام کے بارے میں ڈسکس کریں گے۔“

فیضان خاموش رہا۔ دونوں خاموش تھے لیکن ان کی خاموشی بہت کچھ بول رہی تھی۔

”میں چلوں۔۔۔؟“ وہی لڑکی سی رائیل پھر معصومیت سے پوچھ بیٹھی۔

”میں اپنی زبان سے تمہیں جانے کے لئے نہیں کہوں گا۔ تمہاری اپنی مرضی ہے۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جاؤں؟“

”مجھ سے مت پوچھو۔“ وہ فائل ہاتھ میں لے کر بولا۔

وہ جانے لگی دروازے تک پہنچی تھی کہ فیضان کی بے تاب صدا سنائی دی۔

”رائیل۔“

”جی؟“ اس نے مڑ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ کہہ کر وہ فائل کھول کر بیٹھ گیا۔ ناراض ناراض سا۔ وہ ایکدم سے آفس سے نکل گئی۔

فیضان کی نظریں آخر تک اس کا پیچھا کرتی رہیں اور پھر اس کے چہرے پر اسی سی چھا گئی۔

☆.....☆.....☆

اسی شام فواد احمد نے سالوں کے بعد اس کو کال کی۔

”کیسی ہیں آپ مس زارا؟“

”میں ٹھیک ہوں مگر آج آپ کو دیکھ کر بہت شاکڈ ہوئی۔ آپ نے اپنا خیال رکھنا ہی چھوڑ دیا۔“

”میرا کام ہی ایسا ہے۔“

”کیوں دن رات خود کو اپنے اسٹوڈیو میں ہی بند کر کے رکھ دیا ہے۔ باہر نکلیں۔ زندگی کی روانی میں آئیں۔“

”میرا پروپوزل اب بھی برقرار ہے۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔“

وہ تو جیسے اس کی کوئی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ زارا ایک دم سن ہو کر رہ گئی۔

”میں کچھ اور نہیں بتا پایا۔ صرف ایک اپنا فلیٹ ہے میرا۔۔۔ جہاں فقط میں ہوں۔“ وہ پھر سے بولا۔

”گھر والے کہاں ہیں؟“

”ایک ہی بہن تھی اس کی شادی ہو گئی۔ ماں نہ رہی بس میں ہوتا ہوں گھر میں۔“

کچھ دیر تک تو زارا کو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ اس سے کیا کہے پھر بہت دھیرج سے بولنا شروع کیا۔

”نواد احمد! میں آج یہ بات کلےئر کرنا چاہتی ہوں کہ یقین کریں کہ نہ پہلے اور نہ آج۔۔۔ میں آپ کا

پروپوزل ایکسپٹ نہیں کر سکتی۔۔۔ اس لئے نہیں کہ آپ میں کوئی کمی ہے بلکہ اس لئے میں نہ اس وقت اور نہ

اب۔۔۔ میں اپنی کیونٹی سے باہر شادی کر ہی نہیں سکتی۔“

”کیا واقعی صرف یہی سبب ہے؟“

”ہاں!“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں سمجھ گیا۔ اسی لئے ابھی تک آپ کی شادی نہیں ہوئی۔۔۔ ورنہ آپ جیسی پیاری لڑکی

کے لئے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ میں پھر کبھی بھی یہ بات نہیں کروں گا۔“

”آپ شادی کر کے اپنا گھر بسائیں۔ اگر کہیں تو میں آپ کے لیے رشتہ تلاش کر سکتی ہوں۔“

”ارے نہیں۔۔۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔“

اس نے کال ڈسکلیٹ کر دی زارا کو اس کی باتوں نے دکھی کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کئی سال پہلے

اس نے واقعی سنجیدگی سے اسے پروپوز کیا تھا۔ مگر بچپن سے خاندانی روایات کی پاسداری ان کی کیونٹی میں اس

قدر کوٹ کوٹ کر بھردی جاتی ہیں کہ وہ غیر ذات کے لڑکوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتیں تھیں۔ جب



شاہد نے شادی کی تو اس نے سوچا۔

”لڑکوں کی محبت وقتی اہال ہوتا ہے آج اس نے شادی کر لی ہے کل فواد احمد بھی کر لے گا۔ ویسے بھی انہوں نے صرف پروپوز ہی کیا تھا۔۔۔ اور۔۔۔ پروپوزل بھیجنا پروپوز کرنا عام سی بات ہے۔ اکثر خواتین بھی تو اس کا رشتہ ۱ پروپوزل لے کر آئیں مگر بات نہ بن سکی۔

یہاں نہ عشق کے دعوے تھے نہ کوئی عشقیہ ڈائیلاگ۔ مگر جہاں محبت کے دعوے اور ڈائیلاگز بھی تھے اور وعدے بھی تھے۔۔۔ وہ ایسا گیا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

☆.....☆.....☆

رائیل نے فیضان کی خواہش پر ادبی جویدے کے آرٹ سیکشن کے انچارج کی حیثیت سے چارج سنبھال لیا تھا۔ فیضان نے اس کے لئے چھوٹا سا آفس بھی سیٹ کروا لیا۔ اب وہ ہر روز شام کو پانچ سے سات تک آفس جاتی۔ اسے یہ تہدیلی اچھی محسوس ہوئی۔ آفس میں زیادہ تر نو جوان لڑکیاں تھیں۔ جو بولڈ اور اسمارٹ تھے۔ ایک دن اس کی طبیعت بہت گھبرائی۔ وہ گھر جانا چاہ رہی تھی کہ اپنی طبیعت سے واقف تھی کہ اب جو گھبراہٹ شروع ہوئی ہے تو وہ کام نہیں کر پائے گی۔ وہ گھر جانے کی اطلاع دینے کے لئے فیضان کے آفس میں گئی۔ اس وقت اس کا چہرہ بالکل پیلا ہو رہا تھا اور عجیب وحشت سی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر فیضان ایک دم سے پریشان ہو کر اپنی سیٹ سے اٹھا اور پوچھا۔

”خیر تو ہے؟ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

جواب دینے کے بجائے رائیل دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ فیضان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سچ کہا کرتی تھی۔ اس کی حالت ایسے ہی اچانک خراب ہو جاتی ہے۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہو جائے گی کچھ نہیں ہوگا۔ بیٹھ جاؤ تھوڑی دیر یہاں پر۔“

فیضان بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور چپڑا اسی کو بلا کر اسے فریش جوس لانے کے لئے کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ آفس کے سامنے کے فریش جوس کی دکان سے جوس لے آیا۔ ایک رائیل کے سامنے ٹیبل پر رکھا اور دوسرا

فیضان کی ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ رائیل اسی طرح گم صم سی بیٹھی تھی۔ جوس اس کے سامنے رکھا رہا۔ تب فیضان نے بڑے پیار اور دھیرج سے اسے سمجھانا شروع کیا۔

”رائیل ہمت کرو۔ حوصلہ لاؤ اپنے اندر جینے کا۔ زندگی ایسے کیسے گزرے گی؟ لوگ نہ جانے زندگی کی کیا کیا اذیتیں برداشت کرتے ہیں۔ ہم تو بہت بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ پلیز!۔۔۔ بی ریلیکسڈ! جوس پیو۔ یقین کرو کہ خود کو بہت فریش محسوس کرو گی۔ یہاں کا جوش بہت اچھا اور توانائی سے بھرپور ہوتا ہے۔“

رائیل کو بھی لگا کہ وہ خود بھی پریشان ہو رہی ہے اور فیضان کو بھی پریشان کر رہی ہے۔ اس نے جوس کا گلاس اٹھایا اور آہستہ آہستہ سب لینے لگی۔ فیضان اسے مسلسل سمجھاتا رہا۔۔۔ دھیمے پن سے۔۔۔ اپنائیت سے۔ پھر نہ جانے جوس کا اثر تھا یا پھر فیضان کی باتوں کا کہ کچھ ہی دیر میں وہ نہ صرف ریلیکس ہو گئی بلکہ خود کو فریش بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے فیضان کا شکریہ ادا کیا اور واپس اپنے آفس میں آ کر کام میں مصروف ہو گئی۔

جاتے وقت وہ اپنا کمپوز کیے ہوئے آرٹیکل کی فائل فیضان کے حوالے کرنے گئی تو وہ اسے دیکھ کر مسکرا کر بولا ”شکر ہے کہ تم اب تک بیٹھیں در نہ میں نے تو سمجھا تھا کہ ہمیشہ کی طرح میری بات نہیں مانو گی اور گھر چلی جاؤ گی۔“

رائیل کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔ جب وہ جانے لگی تو فیضان نے اسے پکارا۔

”جی۔“ اس نے مڑ کر کہا۔

”اپنا بہت خیال رکھنا رائیل!“

نہ جانے اس کی نظروں اور لہجے میں ایسا کیا تھا کہ اس کے اندر تک سکون سا اترتا محسوس ہوا تھا اسے۔

”جی“ کہہ کر وہ تیزی سے آفس سے نکل گئی اور آخر تک اسے فیضان کی نظریں پیچھا کرتی ہوئی محسوس ہوئیں

☆.....☆.....☆

”ہمارے یونیورسٹی کے دور کی لٹری سوسائٹی میں دو ہی تو خوبصورت لڑکیاں تھیں ایک تم اور ایک رائیل۔۔۔! باقی لڑکیوں کے برعکس جتنی خوبصورت تھیں اتنی ہی غیر رو میٹک۔۔۔! وہ محترمہ کام کی بات کرنے کے علاوہ بولنا پسند ہی نہیں کرتیں تھیں۔ بہت رزرو تھی اور ایک تم۔۔۔! ذرا ذرا سی بات پر لڑنے کے لئے تیار

بیچارے لڑکے آپیں بھرتے رہتے مگر مجال ہے کہ ان پاگل لڑکیوں۔۔۔ ایک آرٹسٹ اور دوسری لکھاری کو احساس بھی ہوتا۔۔۔ اور۔۔۔ ہوا بھی تو کس کا۔۔۔ ”شاہ جی“ کا؟۔۔۔ میں تو حیران ہو گیا ہوں یہ سب جان کر۔۔۔ ذرا یقین کرو کہ وہ کہاں تھا اس قابل کہ تم جیسی لڑکی اس میں انوالو ہوتی۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے اس سے محبت نہیں کی تھی صرف اس کی محبت کو قبول کیا تھا صرف اپنی مجبوری کی وجہ سے۔“

”بس!۔۔۔ یا کچھ اور بھی کہنا ہے؟“ زارا نے علی حیدر کی لمبی بات سن کر کہا۔

”نہیں بات ابھی باقی ہے۔“

”وہ بھی فرما دیجئے۔“

”تم یونہی تنہا کیسے زندگی گزارو گی؟“

”ویسے ہی جیسے جوان بیوہ اور طلاق یافتہ عورتیں تنہا گزار دیتیں ہیں۔ تب لوگوں کو ان تنہائی کی فکر نہیں ہوتی جبکہ ہمارے مذہب میں ان سے شادی کرنے کو احسن بتایا ہے۔ اگر وہ دوسری شادی کر لیتی تو سب سے پہلے ہماری خواتین ہی ان کے متعلق عجیب و غریب باتیں کرتی ہیں جب کہ باقی اسلامی ملکوں میں بیوائیں اور طلاق یافتہ عورتیں دوسری شادی کرتی ہیں اور نارمل زندگی گزارتی ہیں۔ ہمارے ہاں صرف کنواری خواتین کے پیچھے ہی پڑ جائیں گے سب۔ ہمیشہ یہی سوال شادی نہیں کی۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ کیوں۔۔۔ جیسے کہ لوگ معصوم ہیں کہ جانتے نہیں کہ ہمارے ہاں ذات برادری، اسٹیٹس کی اونچ نیچ، جھڑ کے مسائل کے علاوہ ایسا بھی ہوتا ہے لڑکیاں کفیل ہوتی ہیں خاندان کی اس لئے شادی نہیں ہوتی یا نہیں کرتیں۔۔۔!“

یونہی لڑتے جھگڑتے۔۔۔ ایک دوسرے سے اپنے مسائل اور مصروفیات شیر کرتے وہ دونوں غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے بہت قریب گئے۔۔۔ بہت ہی اچھے دوست بن گئے۔

☆.....☆.....☆

ایک دن جب رائیل اپنا کام مکمل کر کے جانے لگی تو فیضان نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے بیٹھ گئی۔ پھر اس کی نظر اس کی ٹیبل پر پڑی ہوئی اپنی فائل پر پڑی جو اس نے کچھ دن پہلے اسے دی تھی۔ اس میں اس کے کئی سال پہلے کے آرٹ کے حوالے سے مختلف اخباروں اور میگزینز میں چھپے ہوئے

آرٹیکل اور اس کی اپنی پیسنگز کی نمائشوں کی رپورٹیں اور انٹرویو وغیرہ تھے۔

”رائیل! میں تو تمہاری یہ قائل بلکہ پروقائل دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔ اس کو دیکھنے کے بعد ذہن میں ایک ہی ایکٹیو، بااعتماد اور سوشل لڑکی کا تصور ابھرتا ہے جس کی ایک بھرپور شخصیت تھی۔ پھر۔۔۔ آج میرے سامنے ایک بالکل ہی مختلف رائیل کیوں ہے؟ ڈری ڈری اور سہمی سی، بہت مایوس بھی۔“

فیضان نے کہا۔

”بس۔۔۔ فیضان صاحب! ہر انسان ایک ایسے دور اور عمر سے گزرتا ہے جب وہ اپنی آنکھوں میں بہت سے سنے سجالیتا ہے اس کے اندر بہت توانائی اور جوش ہوتا ہے۔ وہ اپنے مستقبل سے بہت پر امید ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے غلط رویوں اور لوگوں کی نیگٹیو سوچ کو بدلنے میں اپنے جیسی سوچ رکھنے والوں کے ساتھ مل کر اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ مگر وقت گزرنے سے اسے احساس ہوتا رہے کہ یہ کام نہ صرف مشکل ہے مگر تقریباً ناممکن بھی۔“

میں بھی اسی دور میں تھی۔ بہت باہمت اور بااعتماد تھی۔ لوگ تو مجھے چٹان سمجھتے تھے مگر اس چٹان کے اندر۔۔۔ اس کا دل تو موم جیسا نرم تھا۔ لوگوں کے منفی رویوں اور منافقتوں نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ اب میں وہ پہلے والی رائیل کہاں؟ میرا دل اور پورا وجود ریزہ ریزہ ہے۔ اب آنکھوں میں کوئی خواب نہیں۔“

وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے کہتی رہی تو فیضان اسے بہت غور سے سن اور دیکھ رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو ایک دم بولا۔۔۔

”فلاط سوچ تمہاری۔ تم صرف self. centred ہو کر سوچتی ہو۔ بہر حال۔۔۔ مجھے تمہارے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے لئے تو یہ رائیل بہت اہم ہے جو اس وقت میرے سامنے ہے۔“

وہ اسے کچھ ایسے دیکھنے لگا کہ وہ بالکل گھبرا سی گئی پھر فوراً اسے ’خدا حافظ‘ کہتی آفس سے نکلتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

جس معاشرے میں مرد میل شاؤنزم (احساس تحاخر مردانہ) میں مبتلا ہوں وہاں وہ عورت کی اونچی حیثیت کو بھلا کہاں قبول کرتے ہیں۔ عورت مرد کی طرح نوکری کر کے خاندان کی کفالت میں برابری کی حصہ



دار ہو یا پی۔ ایچ۔ ڈی کر لے۔۔۔ گھر میں شوہر صاحب یہی احساس دلائیں گے کہ کچھ بھی ہو وہ مگر وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ وہاں کوئی عورت اپنی محنت اور صلاحیتوں سے کسی ادارے کی اعلیٰ آفسر بن جائیں تو وہ مرد حضرات جو اس پوسٹ پر پہنچنا چاہتے تھے یا اس کے ماتحت کام کرنے میں خوش نہ ہوں تو سب سے مل کر اس عورت کے خلاف محاذ کھڑا کر دیتے ہیں۔

یہی کچھ لائبرہ خان کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس کو جیسے ہی ادبی بورڈ کی چیئر پرسن کی حیثیت سے ترقی دے کر عہدہ دیا گیا تو اس کے خلاف ایک مخصوص ٹولے نے محاذ آرائی شروع کر دی تھی۔ حالانکہ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی بھی تھی اور برسوں سے اسی ادارے سے وابستہ تھی اور ریکریٹری کی پوسٹ پر برسوں کام کر چکی تھی۔ پھر اس کا کام اور اہلیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ نہ صرف ایک پختہ شاعرہ تھی مگر اکثر کانفرنسوں میں تحقیقی مقالے بھی پڑھتی۔ اس کے تحقیقی کام کتابوں کی صورت میں ریکارڈ پر تھے۔ چند سال پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہوا تھا اور وہ اپنی سولہ سالہ بیٹی کے ساتھ تنہا رہتی تھی۔

مرد اس معاملے میں بڑے متحد ہوتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ادیبوں کے ایک مفاد پرست ٹولے کے ساتھ مل کر لائبرہ خان کو اس پوسٹ سے ہٹانے کی تحریک شروع کر دی اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ انہوں نے اس کی کردار کشی شروع کر دی۔ سوشل میڈیا پر فیک آئی ڈیز بنا کر اور مختلف پوسٹوں پر کمینٹس سے لے کر اس کی فیک تصاویر اپ لوڈ کی گئیں۔

ایسی صورتحال میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ خواتین عورت کا ساتھ دینے کے بجائے یا تو خاموش رہتی ہیں یا اس کو ڈراتی ہیں کہ مردوں کا معاشرہ ہے وہ بچکانہ لے سکتیں مگر زارا سے یہ بات برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”علی! ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔ یہ بھی ہماری کلاس فیلو اور لٹری سوسائٹی کی ممبر تھی۔ ہم تو سالوں سے اسے جانتے ہیں پھر اس کا کام شفاف اور قانونی ہے۔“

”کیا کرنا چاہئے ہمیں؟“

”میں تو اس کے ساتھ کھڑی ہو جاؤں گی۔“

”وہ تو گالیاں کھا رہی ہے پھر تم بھی کھاؤ گی؟“

”یہ تم کہہ رہے ہو جو این۔ جی۔ او میں ہو اور خواتین کے ساتھ زیادتیوں میں اکثر تم لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہو۔“

”ہاں!۔۔۔ مگر آفیشلی جب تک وہ ہم سے مدد نہیں مانگتی ہم بچ میں نہیں آ سکتے۔ البتہ میں اپنے دوستوں کے حلقے سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اس کی فیور میں کمٹس کریں اور پوش لگائیں۔ ایک تم ہو کہ سوچل میڈیا کے اس دور میں بھی ابھی تک نہ فیس بک اکاؤنٹ بنایا ہے نہ ٹویٹر پر نہ ہی انسٹاگرام پر۔“

”مجھے نہیں دلچسپی فیس بک وغیرہ سے نہ ہی میرے پاس ٹائم ہوتا ہے۔ اور۔۔۔ نہ جانے مجھے کیوں لگتا ہے کہ یہ زیادہ تر دھوکے کی دنیا ہے۔ نہ جانے کتنے فیک اکاؤنٹس ہیں۔ میں تو رائٹر ہوں بیچاری عام خواتین کو بھی نہ جانے کیسے الٹے سیدھے میسج کرتے ہیں لوگ۔ نہ جان نہ پہچان بس صرف یہ پتا ہے کہ دوسری طرف کوئی عورت ہے۔“

”تو کیا یہ سب کچھ نیٹ کے علاوہ نہیں ہوتا؟ مجبوری ہے کہ دور ہی نیٹ کا ہے۔ تمہارے ساتھ رائٹر ز اور شاعرات اپنے اکاؤنٹس اور میگزین پر اپنا کام شیئر کر کے شہرت حاصل کر رہی ہیں ایک تم ہو کہ جو گن بنی ایک سائیڈ پر بیٹھی ہو۔“

”اب تو آنا ہی پڑے گا نیٹ پر میں لائبر سے رابطہ کرتی ہوں اور اس کا ساتھ دو ہیں سے دے کر شروعات کروں گی۔ حد ہو گئی ہے اتنی ادبیائیں خاموش تما شائی بنی ہوئی ہیں۔ ان کو تو متحد ہونا چاہئے ایسے معاملات میں تاکہ جرات نہ ہو پھر لوگوں کو۔ اگر اس کا پرموشن اور اپنا کنٹنٹ فیلڈ ہوتا تو کورٹ میں چیلنج کرتا کوئی بندہ جس کا حق مارا گیا ہو۔۔۔ مگر یہ گند تو نہ کریں۔“

☆.....☆.....☆

اب وہ آفس میں اچھی خاصی سیٹ ہو گئی تھی ویسے تو سب سے ہی اس کی ہیلو ہائے تھی مگر سیما اس کے بہت قریب رہتی تھی۔ وہ بہت پیاری اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ اکثر وہ اس کے آفس میں آتی رہتی تھی۔ سیما کے علاوہ ناہید بھی کبھی کبھار آ کر اس کے آفس میں بیٹھ جاتی تھی۔ وہ بہت ہی الٹرا ماڈم کی لڑکی تھی۔ اور اس کی اداؤں کی وجہ سے رائیل کو اس کی کہنی میں کوفت ہوتی تھی مگر بہر حال اس نے اپنے رویے سے اسے ایسا

احساس ہونے نہیں دیا تھا کہ گھر کی دنیا سے باہر مختلف لوگوں سے واسطہ ہی پڑتا ہے اور ہر کسی کے ساتھ چلنا بھی پڑتا ہے۔ وہ لڑکیوں اور لڑکوں سے بہت فریج تھی اور بات بات پر زوردار قہقہے لگانا اس کی عادت تھی۔ ایک دن جب وہ آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد فیضان کو الوداع کہنے کے لئے اس کے آفس میں گئی تو اس کی زبان پر شکوہ آگیا۔

”تم نے تو خود کو آفس کا کوئی عام ورکر بنا لیا ہے۔ ابھی تم باقاعدہ ملازم تھوڑی ہو آفس کی۔ کبھی کبھار تھوڑا سا ٹائم نکال کر میرے پاس بھی آ کر بیٹھ جایا کرو۔ آج ساتھ چائے پیئیں گے۔“

”ایز یوش!“ کہتی ہوئی وہ مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں چائے بھی آگئی تو فیضان نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”ارے تم اتنی دور کیوں بیٹھی ہو؟ ادھر آ جاؤ۔“ وہ قریب والے صوفے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”میں یہاں ٹھیک ہوں۔“

”بھئی۔ تم پہلے دن سے ہمیشہ میرے قریب والے صوفے پر بیٹھتی ہو اس لئے عادت سی ہو گئی ہے یہاں دیکھ کر بات کرنے کی۔“

رائیل یہ سن کر مسکرائی اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتی ہوئی اپنے مخصوص صوفے پر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ دونوں چائے پینے لگے آج وہ ہلکے آسمانی رنگ کے پرنیڈ سوٹ اور نیچرل میک اپ میں بہت نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ فیضان اس کی طرف بہت چاہ سے دیکھتا رہا اور کبھی چوری پکڑی جانے پر شرارت سے مسکرا کر کھڑکی سے باہر شام کے گلجے اندھیرے میں لان میں جانے کی یاد دیکھنے کی کوشش کرتا تو رائیل زیر لب مسکرا پڑتی۔ اسے فیضان کی یہی ادا بہت بھاتی تھی۔ وہ عام مردوں کی طرح اسے گھور کر نہیں دیکھتا مگر بڑی شائستگی ہوتی تھی اس کے رویے میں۔ اچانک ہی اس نے اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”اب تم دن بدن فریش ہوتی جا رہی ہو۔ اب تو طبیعت سیٹ لگتی ہے۔“

”آپ کو کیسے گا؟“

”ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بس لگا۔“ اس نے کہا اور پھر اس کی نظریں کھڑکی سے باہر گہری ہوتی ہوئی شام کو

دیکھنے لگیں۔

رائیل کو لگا کہ اس کے دل میں کوئی بات ہے جو وہ کہنا بھی چاہ رہا تھا اور کہہ بھی نہیں پا رہا تھا۔ پھر اچانک اس نے کہا۔

”لگتا ہے کہ مجھے اپنا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا۔“

”کون سا پروگرام؟“ رائیل نے حیرت سے پوچھا۔

”میٹل ہاسپٹل میں کمرابک کروانے کا۔“ وہ بھرپور شریر مسکراہٹ سے اچانک بولا تو رائیل نے چڑ کر کہا۔

”اور میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اکیلی تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔ دونوں مل کر چلیں گے۔“

”ظاہر ہے۔ میں تو چلوں گا ہی تمہیں attendant کی ضرورت بھی تو پڑے گی۔“

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو بے اختیار رائیل کو بھی ہنسی آ گئی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے اور آس پاس جیسے پھول کھل اٹھے تھے۔

☆.....☆.....☆

زارا لائبہ خان سے ملی اور اس کے ساتھ کھڑے رہنے کا اعلان کیا۔ اس ملاقات کے فوٹو اور اعلان اس نے اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر شیئر کیا۔ وہ اکاؤنٹ بنا چکی تھی اور اب اس نے بھی بھرپور مہم شروع کر دی اس کی فیور میں مگر اسے بہت افسوس ہوتا کہ سنئیر موسٹ خواتین جو ادب میں ایک بڑا مقام رکھتی تھیں اور اس کے پاس ایڈ تھیں بالکل خاموش ہوتیں البتہ نوجوان ادیبوں کو اس کے آگے آنے سے حوصلہ ہوا اور وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئیں۔ اب جو مفاد پرست ٹولہ لائبہ خان کو تنہا سمجھ کت اسے ٹارگٹ کر رہا تھا ان کی توپوں کا رخ خود زارا کی طرف بھی ہو گیا اور اس کی شخصیت کو بھی متنازعہ بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس صورتحال میں سنئیر ادیبوں کو چاہئے تھا کہ بیچ میں پڑ کر معاملات کو دسرت کرنے کی کوشش کرتے مگر یہاں صرف ذاتی مداف دیکھ کر یا پھر دوستیاں نبھائی جاتیں۔

معاملات ان باکس، واٹس ایپ اور سیل فون پر گالم گلوچ پر آ گیا تو زارا نے علی حیدر کو یہ سب دکھایا تو وہ فکرمند ہو کر بولا۔



”مجھے اسی بات کا خدشہ تھا بہر حال اب ہم مل کر اس معاملے کو دیکھیں گے۔“

اس نے اپنے والد کے دوست اور سنئیر وکیل فیاض علی صاحب سے مشورہ کیا تو اس نے زارا اور لائیبہ کو مشورہ دیا کہ ان دونوں کو کراچی جا کر ”سائز کرائم سیل“ میں FIR درج کروانی چاہئے۔

وہ دونوں علی حیدر کے ہمراہ کراچی FIA کی بلڈنگ میں واقع سائبر کرائم سیل میں تمام ثبوت، پوشش اور گالیوں بھرے میسجز دکھائے تو ان کی ایف آئی آر درج کر دی گئی اور چالان بھی کر دی گئی اور متعلقہ اکاؤنٹ ہولڈرز، فون نمبرز سے ان نمبروں کے مالکوں کو کورٹ نوٹسز ملے اور مقدمہ چلایا گیا تو سب میں جیسے بھگدڑ مچ گئی۔ یوں نہ فقط الزامات کردار کشی اور گالیوں کا طوفان تھا مگر اب وہ لوگ اپنی جان سائبر کرائم کیس سے چھڑوانے کے لئے لوگوں سے کہلوار ہے تھے کہ ایک دو کے وارنٹ بھی نکالے گئے تھے۔

”زارا اگر تم میرا ساتھ نہ دیتیں تو میں تو بچ بچ بوکھلا کر رہ گئی تھی۔ پھر میرے ساتھ کوئی مرد بھی نہیں تھا۔ میرے شوہر کی وفات کے بعد گھر میں میری ساس اور بیٹی کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے۔“

”کریڈٹ تمہیں بھی جاتا ہے ورنہ عموماً خواتین ایسے کیسز میں جانے سے گھبراتی ہیں۔ عورتوں کی حفاظت اور توقیر کے لئے ہمیں ”ویمن کمپلیٹ سیلز“ بنائے جا چکے ہیں اور ورکنگ ویمن کو جنسی طور پر حراساں کرنا قانونی جرم ڈکلیئر کرتے ہوئے

**Protection for women against Harassment at workplace .**

**Act 2010**

کے منظور ہونے کے بعد صوبائی اور فیڈرل عدالتیں قائم کی گئیں ہیں جو عام عدالتوں کے برعکس پوری پرائیویسی سے کیس چلا کر مجرموں کو سزا بھی دیتی ہیں۔“

”کتنی عجیب بات ہے کہ اتنا پڑھا لکھا ہونے کے باوجود مجھے نہ تو اس آرڈینینس کے بارے میں پتہ تھا نہ ہی کمپلیٹ سیلز اور سائبر کرائم لاء کے بارے میں۔“

”اکثر خواتین کو نہیں معلوم صرف آپ کو نہیں۔“ زارا نے کہا

”قانون بن جاتے ہیں مگر جب تک خواتین اپنی ہی حفاظت کے لئے بنے ہوئے قانون کی مدد سے ایسے

گھٹیا لوگوں سے نہیں لڑیں گے تب تک وہ عورت کی عزت و توقیر کو قدموں تلے کھلتے رہیں گے۔“

فواد نے کہا وہ سب انکل فیاض کو تھینکس کہنے آئے تھے جنہوں نے قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی تھی۔

”بیٹا! آپ لوگ غیر معمولی خواتین تھیں اس لئے آگے تک گئیں۔ ہمارے معاشرے میں بچیاں یہ سب برداشت کرتی ہیں۔ کیونکہ ان کے گھر والے ہی ان کو اجازت نہیں دیتے کہ کوئی بات باہر جائے کہ کہیں بچیاں ہی بدنام نہ ہو جائیں۔ اسی لیے اسکول، کالجوں، یونیورسٹیوں سے لے کر ہر ادارے کی طالبات اور ورکنگ لیڈیز کو مختلف طریقوں سے ہراساں کیا جاتا ہے۔ مگر وہ بدنامی یا نوکری کھونے کے ڈر سے سب کچھ برداشت کر جاتی ہیں۔“

”افسوس کا مقام ہے۔۔۔“ لائیبہ نے دکھ سے کہا۔

لائیبہ کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد علی حیدر زارا کو گھر ڈراپ کرنے جا رہا تھا کہ اچانک وہ درد انداز طریقے سے بولا

”خواتین کے لئے تو پرنٹیشن ایکٹ ہے اور کمپلیٹ سیل ہے۔۔۔ کیا علی حیدر کے لئے بھی ہے؟“

”کیا مطلب؟“ زارا حیران ہو کر بولی۔

”یہ دیکھو۔۔۔ ا“ اس نے اپنا موبائل سیل زارا کی طرف بڑھایا۔ اور جب اس میں موجود میسجز پڑھے تو بوکھلا کر رہ گئی۔ اسے بھی گالیاں ملیں تھیں اور اس کا تعلق زارا اور لائیبہ سے جوڑ کر جو کچھ لکھا تھا۔۔۔ اسے پڑھ کر اس کا ذہن بھک سے اڑ گیا۔

”واہیات۔۔۔ کمینہ شخص۔۔۔ کون ہے یہ؟“

”ریلیکس پرانے میسجز ہیں یہ۔ میں تم دونوں کے ساتھ تھا یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی تو پھر۔۔۔ گالیوں میں کچھ حصہ تو میرا بھی بنے گا۔ شکر ہے کہ انکل فیاض بیک گراؤنڈ سپاہی تھے ورنہ ان کو بھی گالیاں ملتیں۔“

”یہ تم انہی دوسرے ثبوتوں کے ساتھ کورٹ میں دیتے۔“

”تم لوگوں کے ناموں سے جڑی گالیاں؟۔۔۔ نہ بابا علی حیدر کے اپنے قانون ہوتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”گالیاں بھیجنے والا اس وقت ہسپتال میں ہے۔ صرف ایک بازو کا فریکچر ہوا ہے جس کو استعمال کرتے ہوئے اس نے یہ غلیظ الفاظ ٹاپ کئے ہوئے۔“

”اوہ گاڈ!۔۔۔ تم تو بہت خطرناک ہو۔ مجھے تو آج پتہ چلا۔“

”بس۔۔۔! عشق کے معاملے میں اپنی بہادری بھول جاتا ہوں۔۔۔ خود کو پیش کر دیتا ہوں دشمنِ جاں کے آگے کے قیدی بنالو۔“

”شٹ اپ!“

☆.....☆.....☆

رائیل کو فیضان کے آفس میں کام کرتے تین ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ اب وقت ملنے پر فیضان کے آفس میں جا کر بیٹھتی تھی اور مختلف سوشل موضوعات پر بات کرتے تھے۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ آفس کے کچھ لوگ اس کی فیضان سے قربت پر معنی خیز مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے تھے۔ کبھی تو اسے ان کی پیچھا کرتی ہوئی نظریں اپنے جسم سے آر پار گزرتے ہوئے محسوس ہوتی تھیں اور وہ جب فیضان کے آفس میں بیٹھی اس سے باتیں کرتی تھی تو یوں لگتا تھا کہ دیواروں، کھڑکیوں اور دروازوں سے بھی نظریں گھور رہی ہیں۔ یہ دراصل اس Insecurity کے احساس کا نتیجہ تھا جسے وہ اکیلے رہتے عرصے سے سہہ رہی تھی۔

ہر وہ عورت جو گھر سے باہر قدم رکھتی ہے۔ وہ ایسی نظروں کو کہیں نہ کہیں ضرور برداشت کرتی ہے۔ طنزیہ نظریں، مشکوک نگاہوں سے دیکھنے والی نظریں معنی خیز لگا ہیں۔۔۔ اسے لگتا کہ وہ نظریں ہر وقت اس کا پیچھا کر رہی ہوتی ہیں جب تک کہ وہ گیٹ پار نہیں کر جاتی۔ گھر پہنچ کر اسے لگتا کہ جیسے وہ ایک مضبوط پناہ گاہ میں آگئی ہو۔ تب وہ سکھ کا سانس لیتی۔ ایسا کیوں تھا؟ وہ تو عرصے سے یونیورسٹی میں جاب کر رہی تھی۔ اس کے لئے مردوں کی دنیا نئی نہیں تھی پھر یہاں کیوں۔۔۔؟ شاید اس لئے کہ وہاں کوئی فیضان جیسا نہیں تھا جس کے پاس بیٹھ کر وہ خوش ہوتی تھی۔۔۔ مگر جتنا خوش ہوتی تھی، اتنا ہی وہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی۔

ابھی اتنا ہی تھا کہ ایک نئی بات ہوگئی۔ ایک دن سیمانے اس سے کہا۔

”میڈم! آج ناہید نے مجھ سے فیضان صاحب کے متعلق ایک عجیب بات کہی ہے۔“

”کون سی بات۔۔۔؟“ لیپ ٹاپ پر چلتی اس کی انگلیاں رک گئیں۔

”وہ کہتی ہے کہ فیضان صاحب اس میں interested ہیں۔“

”بالکل بکواس۔۔۔۔۔“ رائیل ایکدم غصے سے بولی۔

”میں ان کو بہت عرصے سے جانتی ہوں۔ وہ بہت ہی descent انسان ہیں۔ البتہ میں نے نوٹ کیا ہے کہ وہ ان سے فری ہونے کی کوشش کرتی ہے کبھی کبھار تو وہ کوئی کام کا بہانہ لے کر آ کر بیٹھ جاتی ہے ان کے پاس پھر اس کی ادائیں دیکھیں ہیں تم نے؟ اس کی ڈریسنگ۔۔۔۔۔“

”کچھ عرصہ پہلے اس کی مگنی بھی نوٹ چکی ہے۔“ سیما نے اطلاع دی۔

”مجھے یہ لڑکی اوور کونفیڈنٹ لگتی ہے اسے یہ کامپلیکس ہے کہ وہ بہت حسین ہے اور جو بھی اس سے بات کرتا ہے یہ اس مرد کے بارے میں خوش فہمی میں پڑ جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی ہوا ہو۔“

”ہوں۔۔۔ شاید۔۔۔“ سیما نے کہا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

رائیل کے دل میں یہ بات ایک سی گئی۔ وہ آفس ٹائم کے بعد حسب معمول فیضان کو جانے کی اطلاع دینے کے لئے اس کے آفس کی طرف جانے لگی کہ اس نے فیضان کے آفس سے ناہید کو ٹھکے دیکھا۔

”آج کل ان پر بڑی نظر کرم ہے صاحب کی۔“ کسی نے کمنٹ پاس کیا اور اس کے قدم وہیں رک گئے اس نے سوچا۔

لوگوں کی ذہنیت بھی کتنی گھٹیا ہے جہاں مرد اور عورت کو بات کرتے دیکھا بس ایک ہی مطلب لیتے ہیں اس نے سوچا کہ یہی لوگ اس کے بارے میں بھی کیا کچھ نہ کہتے ہوں گے۔ یہ سوچ کر وہ اتنی پریشان ہوئی کہ اسے جانے کی اطلاع دیئے بغیر گھر چلی آئی۔ گھر پہنچ کر وہ کچھ دیر بیٹھی کہ فیضان نے اسے کال کی وہ پوچھ رہا تھا

”رائیل! سب خیر تو ہے ناں آج پہلی مرتبہ تم مجھے بتائے بغیر چلی آئیں؟“

”ہاں ابھی سب خیر ہے میں آرہی تھی تمہارے آفس کی طرف مگر پتہ چلا کہ تمہارے کچھ guests آئے ہوئے ہیں۔“

”تو کیا ہوا میں تو ان سے تمہارا تعارف کرانا چاہتا تھا۔“



”اب میں سوچ رہی ہوں کہ تمہارے پاس کم ہی آیا کروں۔“

”مگر۔۔ کیوں۔۔؟ کیا ہوا ہے ایسا؟“ وہ پریشان ہو گیا۔

”کچھ نہیں مگر دیکھو نا، وہ آفس ہے وہاں ہر قسم کے لوگ کام کرتے ہیں۔ پھر لوگوں کی ذہنیت بھی تم جانتے

ہو۔“

”تم پھر سے اس قسم کی باتیں سوچنے لگی ہو؟ لوگوں کی وجہ سے جینائی چھوڑ دو گی؟“

”فیضان! تم مرد بن کر سوچتے ہو۔ میں عورت ہوں۔ میری Limits ہیں۔ مجھے ہر قدم اٹھاتے وقت

سوچنا اور خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

”تمہاری مرضی۔۔۔“ فیضان نے بہت ہی دھکی لہجے میں کہا تھا۔

”میں نے تمہیں کبھی بھی تمہاری مرضی کے بغیر کسی بات کے لئے نہ مجبور کیا اور نا ہی کروں گا۔ میں نے اس

لئے بھی کال کی کہ تمہیں یاد دلا دوں کہ کل انڈس آرٹ سرکل کی طرف سے ہونے والی آرٹ ایگزیشن کی

رپورٹنگ کے لئے جانا ہے تمہیں۔“

”سوری فیضان! میں کنفرم نہیں کر سکتی۔ مجھے بہت عرصہ ہو گیا ہے یہ کام کرتے۔ اب لوگوں کی بھیڑ میں گھبرا

جاتی ہوں۔“

”رائیل! تم تو اچھی خاصی بدل گئی ہو پھر۔۔۔ اب بھی ایسا سوچنے لگی ہو؟ اب تم وہ پہلے والی لڑکی نہ سہی

مگر ایک مچھور ذہن رکھتی ہو۔ پلیز!۔۔۔ خود کو بدلو اور اپنا اعتماد بحال کرو۔ اس سوسائٹی میں survive

کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔“

”میں نے تمہارے سمجھانے پر خود کو بہت بدلا ہے۔ لیکن مجھے وقت تو لگے گا۔“

”بالکل تم لو اپنا وقت۔۔۔ لیکن یاد رکھنا کہ وقت اور حالات کسی کا انتظار نہیں کرتے۔“

اس نے یہ کہہ کر کال ڈسکنیکٹ کر دی اور وہ اس کے کہے ہوئے آخری جملے پر سوچتی ہی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

”کیا میں نے تم سے کبھی یہ ڈیمانڈ کی ہے کہ مجھ سے ملو؟ کیا میں نے تمہیں کوئی ایک بھی غیر اخلاقی میسج کیا

ہے؟ بولو؟

”نہیں۔“

”تو پھر میری محبت میں کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ ایک پاک روحانی رشتہ ہے۔“

”محبت وہی سچی ہوتی ہے جو شادی پر ہی ختم ہونی چاہئے۔“

”محبت اور شادی الگ الگ چیزیں ہیں۔ بعض اوقات محبت کی شادیاں بھی تو ناکام ہو جاتیں ہیں۔

کیوں؟ شادی نے محبت کو ختم کر دیا؟“

”بعض اوقات شادی محبت پیدا کرتی ہے دو انجانے لوگوں میں جو اس بندھن میں بندھ گئے۔“

”صحیح! مگر یہ محبت بھی تعلق اور رشتے سے جڑی ہے۔۔۔۔۔ یعنی مشروط محبت ہے جیسے ماں باپ کی محبت،

بھائی بہنوں کی محبت غیر مشروط محبت عشق کے درجے پر پہنچاتا ہے۔“

”حسین نے محبت کا دعویٰ کیا اور شادی کا وعدہ کیا اور پھر بے وفا کی۔۔۔۔۔ اور اب تم بھی عشق کا دعویٰ

کرتے ہو مگر شادی نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ یعنی اس نے جو کام خاموشی سے کیا وہ تم پہلے سے ہی کہہ رہے ہو۔“

”زارا جی! کم از کم مجھے حسین سے کپیٹر مت کرو۔ میں اگر چپ ہوں تو تمہاری مجبوری کی وجہ سے

۔۔۔۔۔ میری کوئی مجبوری نہیں ہے۔ بولو۔۔۔۔۔ مجھ سے شادی کرو گی؟“

وہ خاموش ہو گئی تو وہ پھر بولا۔

”چلو!۔۔۔ ابھی کورٹ چلو۔۔۔ ہم شادی کریں گے۔۔۔۔۔ جواب دو۔۔۔۔۔ آزماؤ مجھے کہ میں سچا ہوں کہ

جھوٹا۔ زارا! میں حسین نہیں ہوں کہ زندگی میں یوں تنہا چھوڑ دوں گا تمہیں۔“

”تمہارے اوپر ذمہ داریاں ہیں۔ تمہارے گھر والوں کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر چکا ہوں۔ بہنیں اپنے گھروں کی ہو گئیں اور بھائی اب پاؤں پر کھڑے ہیں

امی کو سنبھال لیں گے تم اپنی بات کرو کہ تم کیا چاہتی ہو۔“

زارا کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی۔

”تم بس اب جلدی سے شادی کر لو کسی اچھی لڑکی سے۔ ذمہ داریوں کو تو پورا کر دیا۔“

”زارا! میں حیران ہوں کہ تم جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ، باشعور، پانچ ادبی شہچا روں کی مصنفہ۔۔۔ ابھی تک ذات برادری کی فضول رسوں میں کھڑی ہوئی ہے کہ اپنے دل کی آواز تک سننا چھوڑ دی؟ مذہب اور قانون تمہیں حق دیتا ہے کہ خود اپنا فیصلہ کرو۔ اگر نہیں تو حوالہ دو اور بتاؤ کہ مذہب نے یہ کہا ہو کہ یا تو ذات برادری کے نامناسب رشتوں کو قبول کر لو یا پھر عمر بھر لڑکی کنواری بیٹھی رہے؟“

”مجھے کچھ نہیں پتہ۔۔۔ کیا صحیح ہے کیا غلط مگر ہم اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے بڑوں کی باتوں کا مان رکھا آج کل کی نسل اپنے فیصلے خود کر رہی ہے اور والدین ان کے فیصلوں کو قبول کرتے ہیں مگر بچپن سے ہی ہمارے ذہن میں یہ بیٹھا دیا گیا تھا کہ کیونٹی سے باہر کے لڑکوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر مجھے حیرت ہے کہ لڑکوں کے ساتھ پڑھنے کی بھی آزادی تھی اور لکھنے اور نوکری کرنے کی بھی۔۔۔ یقین کرو اگر حسین میرا رشتہ مانگتا تو میرے والدین میری پسند کو قبول کر لیتے اور ہاں کر دیتے۔۔۔ انہوں نے مجھے اپنے فیصلے کرنے کی آزادی دی تھی مگر میری کیونٹی کے ڈھنگ کے لڑکوں نے کبھی مجھے قبول ہی نہیں کیا کیونکہ وہ میری سماجی حیثیت سے خائف تھے۔“

”بھول جاؤ ماضی کو۔ میں تمہیں اکیلا نہیں دیکھ سکتا۔“ علی نے کہا

”تو پھر ہم دوست بن کر بھی تو ساتھ چل سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے پھر میں امی کو اس رشتے کے لئے ہاں کہہ دیتا ہوں جو انہوں نے میرے لئے ڈھونڈا ہے۔“

علی کا یہ کہنا تھا کہ زارا کے اوپر جیسے بجلی گر گئی۔۔۔



لودھی کا انداز نور لودھی کو کچھ باور کراتا تھا۔

”ماضی۔۔۔ وہ ماضی نہیں حادثہ تھا آصف۔۔۔“ نور کو گہرا صدمہ ہوا۔

”حادثے ہی ماضی بن جاتے ہیں نور۔۔۔ میری جان تم بات کی نزاکت نہیں سمجھ رہی۔۔۔ چاہے وہ حادثہ جس طرح بھی ہماری آبی کی زندگی میں ہوا اب وہ اسکا ماضی بن گیا ہے جو کوئی بھی اسکی زندگی کو ٹٹولے گا وہ یہ ہی دیکھے گا کہ آبی ایک ہفتہ انوار ہی ہے۔۔۔ ایسے میں سردار عزیر نے خود ہماری آبی کا رشتہ بھیجا تمہیں نہیں لگتا یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔۔۔ سردار عزیر ہماری آبی کی پاکیزگی کا گواہ ہے اسے معلوم ہے آبی کیسے اور کن حالات سے گزری ہے۔۔۔ سب کچھ اسکے سامنے ہی تو ہوا۔۔۔“

آصف لودھی نور کو محبت سے سمجھا رہے تھے

”چاہے جو بھی ہو جائے میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے نہیں کروں گی۔۔۔ میرے پاس انکار کی ایک ہی وجہ کافی ہے کہ اسکے دو بچے ہیں وہ بیوی کو تو طلاق دے سکتا ہے مگر اولاد کبھی بھی ماضی نہیں بنتی۔۔۔ یہ ساری زندگی ساتھ رہتی ہے ساتھ چلتی ہے۔۔۔ ہماری زندگی ہی دیکھ لیں آصف۔۔۔ میری اولاد یا آپ کی اولاد۔۔۔ کیا یہ ہمارا ماضی بنی؟۔۔۔ نہیں یہ ہمارا کل بھی تھی آج بھی ہے اور آگے بھی ہمارے ساتھ رہے گی۔۔۔ اور میں اپنی بیٹی کے سر کسی کی اولاد کا بوجھ نہیں ڈالوں گی۔۔۔“

نور لودھی کا فیصلہ اٹل تھا۔۔۔ وہ کہہ کر تیزی سے اندر چلی گئی تھیں۔۔۔

لاؤنج کے دروازے میں کھڑی آبلش خاموشی سے بس سب سنتی رہ گئی۔





علی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔۔  
”دیکھا اداس ہو گئیں ناں؟“

زارا نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔۔ ”ارے نہیں۔۔ میں تو خوش ہوں۔۔ تمہاری زندگی کا سوال ہے۔“

”میں تو کہتا ہوں ایک بار پھر سوچ لو زارا۔۔۔“

”نہیں علی۔۔۔ تم اس لڑکی کے لئے امی کو ہاں کہہ دو اور ہاں۔۔۔ مجھے اس کے بارے میں ضرور بتانا“  
وہ اگلے ہی پل خود کو سنبھال چکی تھی کہ بہر حال علی کو چھوڑنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا پھر وہ کیوں چاہتی کہ وہ اس کی وجہ سے اپنی زندگی خراب کر دے۔۔“  
”آف کورس بتاؤں گا۔۔ تمہیں ہی بتاؤں گا۔۔ اور یہی نہیں ہر بات بتاؤں گا۔۔“ زارا اس کی بات پر مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆

رائیل کام ختم کر کے جانے سے پہلے فیضان کو ایک اہم فائل دینے کے لئے اس کے آفس پہنچی تو وہاں ناہید بیٹھی ہوئی تھی۔ رائیل نے فائل نمیل پر رکھی اور فیضان کو جانے کی اطلاع دے کر لاؤنج میں آئی۔ ڈرائیور نے اسے بتایا تھا کہ وہ پھپھو کے کام سے ابھی مارکیٹ میں ہے اور کچھ دیر میں پہنچ جائے گا تو وہ لاؤنج میں پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ناہید فیضان کے آفس سے نکلی اور اسے لاؤنج میں بیٹھے دیکھا تو تیزی سے اس کے قریب آئی اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر راز دارانہ انداز میں کہا۔

”یہ سر فیضان کیسے آدمی ہیں؟“

”کیوں؟“ وہ اس عجیب سوال پر چونک پڑی۔

”ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔“ اس نے ایک ادا سے اپنے کھلے اسٹریک کئے ہوئے بالوں کو جھٹکا دے کر کہا۔

”تم بھی تو عرصے سے اس آفس میں کام کرتی ہو۔ کیا آج تک انہوں نے کوئی ایسی بات کہی جو تم پریشان ہو گئی ہو۔“

”نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ دراصل کچھ آفس ورکرز ان کے حوالے سے مجھ سے بڑی ذومعنی گفتگو کرتے ہیں کہ جیسے ان کا اور میرا کوئی افیئر ہے۔“

رائیل نے سوچا کہ بظاہر اتنی تیز اور ماڈلر کی کیا جگہ بہت سادہ ہے یا پھر پوز کر رہی ہے اس نے دھیرج سے کہا۔

”ناہید اگھر کی دنیا اور ہوتی ہے لیکن جب ہم قدم گھر سے باہر نکالتے ہیں تو ہمارا واسطہ ہر قسم کے لوگوں سے پڑتا ہے جو مختلف ماحول سے پرورش پا کر آتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ قارل تعلیم حاصل کر کے بظاہر تو بہت ایجوکیٹڈ لگتے ہیں مگر ان کی جڑیں جہالت میں ہی گڑی رہ جاتی ہیں۔ یہ لوگ اپنا لباس اور رہن سہن تو بدل دیتے ہیں مگر بچپن میں ملا ہوا ماحول اور تربیت کہیں ناکہیں ان کے اندر رہ جاتا ہے۔ یہ ہر اس عورت کو برے کردار کا سمجھتے ہیں جو مردوں کے ساتھ کام کرتی ہے۔“

تہدیلی صرف یہ نہیں ہے کہ جدید لباس پہن کر، انگریزی بول کر اور شہری طرز زندگی اپنا کو خود کو ایڈوانس سمجھا جائے بلکہ اصل تہدیلی وہ ہے جو ذہن کو بدلتی ہے اور سوچ میں انقلاب لاتی ہے۔“

آپ کتنی گہری باتیں کرتی ہیں ٹھیکس۔“

اتنے میں چڑا سی نے اسے آکر اطلاع دی کہ اس کی گاڑی آچکی تھی۔ وہ ناہید کو الوداع کہتی ہوئی چلی گئی۔

گھر جا کر اسے اس بات پر شدت سے غصہ آ رہا تھا کہ فیضان کیوں اسے اتنی لفٹ کراتا ہے۔

دوسرے دن وہ اسے اطلاع دیئے بغیر گھر چلی آئی۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ فیضان کال کر کے اس سے سبب پوچھے گا مگر کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی اس کی کال نہیں آئی تو اس نے کوئی اسے کال کی۔

”ہاں رائیل! کیسی ہو؟“ وہ بولا

”میں ٹھیک ہوں۔ آج آپ کو الوداع نہ کہہ سکی کیونکہ تم اس وقت میٹنگ کر رہے تھے کچھ لوگوں سے۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

رائیل پریشان ہو گئی۔ آج اسے اس کے لہجے میں کچھ روکھا پن محسوس ہوا۔ پہلی بار محسوس کیا تھا اس نے ایسا۔ اسے ایسا لگا کہ اب وہ اسے انکسور کرنے لگا ہے۔

میرا رویہ بھی تو اچھا نہیں ہوتا ہے اس کے ساتھ۔ آخر وہ کتنا برداشت کرے۔ اس نے سوچا فیضان کے لہجے نے اسے ایک خوف میں مبتلا کر دیا۔۔۔ اسے کھونے کا خوف۔ پہلی بار اسے شدت سے احساس ہوا کہ فیضان کی ناراضگی یا دوری اس کے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ وہ رات تک بے چین رہی پھر کچھ سوچ کر اسے کال کی۔

”ہاں رائیل! کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”ہیلو“

پھر وہ ہیلو ہیلو ہی کرتا رہا شاید مکمل صحیح نہیں آرہے تھے اور پھر لائن کٹ گئی۔ پھر وہ انتظار ہی کرتی رہی کہ وہ خود کال کرے گا مگر اس کی کال نہ آئی تو اسے بہت دکھ ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ بھی کتنی بیوقوف تھی جو اس سے اتنی امیدیں وابستہ کر بیٹھی تھی اسے کہیں پڑھی ہوئی سطر میں یاد آ گئیں۔

ہم عورتیں بھی

عجیب ہوتی ہیں

سولہ سال کی لڑکی سے لے کر

چالیس سالہ عورت تک

وہی نفسیات ہے

ہم

بہت ہی جلد

مردوں کے وعدوں

اور ان کے کہے ہوئے  
طلسمی الفاظ پر  
اعتبار کر لیتی ہیں

اور  
اپنی آنکھوں میں  
خوبصورت خواب  
بن لیتی ہیں۔۔۔۔

پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آ گیا کہ وہ اپنی انا اور خودداری کیوں بھول گئی ہے۔ اگر اسے اس کی پرواہ نہیں تھی  
تو وہ بھی اسے انور کرے گی۔  
دوسرے دن اس نے یہی کیا۔ فائل فیضان کے حوالے کر کے وہ فوراً جانے کے لئے مڑی تو اسے فیضان کی  
آواز سنائی دی۔

”کہاں جا رہی ہو بیٹھو۔“  
وہ بیٹھ گئی۔

”رات کو کال ہی ڈسکریٹ ہو گئی۔ تم سے بات ہی نہیں ہو پائی تھی۔“ وہ بولا  
”کل شام کو بھی تو آپ نے صحیح رسپانس نہیں دیا تھا جب میں نے کال کی تھی۔“ دل کی بات اس کی زبان پر آ  
ہی گئی۔

”بس وقت میرے آفس میں میرے کچھ دوست آ گئے تھے اس لئے بات نہیں ہو پائی۔“  
”تو پھر بعد میں کال کیوں نہیں کی؟“

انہی دوستوں کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ ہوٹل میں ڈنر کیا اور واپسی کے وقت دیر ہو گئی تھی۔ ”پھر اچانک وہ  
چونک کر بولا۔

”اوہ۔۔۔ ہوا۔۔۔ تو تم اس بات پر ناراض ہو؟“ تم اتنی جلدی بدگمان کیوں ہو جاتی ہو راتیل؟ اس کا



مطلب یہ ہے کہ تمہیں اب تک مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔“

وہ شرمندہ ہو گئی۔

”چلو اب مسکراؤ۔۔۔ بسورتی ہوئی بچی اچھی نہیں لگتی۔“

وہ ایک دم مسکرا پڑی۔ اب عجیب پھولشن تھی دونوں خاموش تھے۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر جب بھی وہ اس کے سامنے اس طرح بیٹھتی تو تمام الفاظ پتہ نہیں کہاں غائب ہو جاتے۔

لیکن گفتگو تو لفظوں کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ خاموش گفتگو۔۔۔ اور کبھی کبھی یہ خاموش گفتگو بولے ہوئے لفظوں سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔

وہ دونوں خاموش تھے مگر خاموشی نے ایک ساز چھیڑ دیا تھا۔۔۔ بہت سحر انگیز سا۔۔۔

اس نے

اپنے ساجن کے سنگ

بتائے ہوئے

لحوں کو

ہمیشہ کے لئے

اپنی مٹھی میں

بند کر کے

محفوظ کرنا چاہا

مگر

مقدر کی لکیروں کو

یہ دخل اندازی

پسند نہ آئی

اور

اس کی بند مٹھی کو  
کھول کر

ان  
انمول لمحوں کو

اس کا

نصیب

بننے نہ دیا

”راہیل!“

طلسماتی خاموشی میں ایک چھنا کہہ ہوا اور وہ چونک پڑی  
”جی!“ اس نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بہت خوبصورت لگ رہی ہو آج۔“ وہ بولا

”جی!“ وہ حیران ہو گئی اس اچانک تبصرے پر اور وہ کنفیوز ہو گیا اس کے انداز پر۔۔۔

”میرا مطلب ہے کہ۔۔۔ یہ سوٹ اور کلر تم پر بیچ رہے ہیں۔“

”تھینکس“ اس نے دھیرج سے کہا اور پھر بولی۔

”او کے! اب میں چلتی ہوں۔“

”جانا چاہتی ہو تم؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”روکنا چاہتے ہو تم؟“ وہ بھی بے ساختہ بولی۔

”ہاں!“

”کب تک؟“

”جب تک رک سکو۔“

”پھر بھی جانا تو ہے۔“

”ہاں۔۔۔“ وہ اداسی سے بولا

”جانا تو ہے۔“

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ دروازے تک پہنچی کہ بے چین صدا سنی

”رائیل!“

”جی؟“ وہ مڑی تو دیکھا کہ وہ عجیب نکلتش میں جتا لگا۔

”تھوڑی دیر کے لئے رک جاؤ۔ میرے پاس رہو۔ میرے سامنے بیٹھو۔“

اس قدر پیار تھا اس کے لہجے میں کہ وہ منع نہیں کر سکی اور واپس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں کے لئے چائے منگوائی۔ دونوں میں بہت باتیں ہوئیں۔

وہ گھر پہنچی تو اس کا موڈ بہت اچھا تھا اور ذہن بہت ہلکا پھلکا۔ آج وہ بہت عرصے بعد پھپھو کے پاس بیٹھی۔ گلاں کے ساتھ کچن میں بھی کھڑی رہی اور بابا بھیرو کو ہدایات دیں کہ وہ لان میں گلاب اور مومچے کے پودے لا کر لگوائے۔

اس رات وہ بہت پرسکون نیند سوئی تھی بہت عرصے کے بعد۔

☆.....☆.....☆

علی حیدر نے اسے ایک تصویر واٹس ایپ کے ذریعے بھیجی اور لکھا۔  
”میری ہونے والی مگیتر۔“

زارا نے تصویر دیکھی کلو زاپ میں ایک خوبصورت لڑکی تھی جس کے گھنے سیاہ بال شانوں پر سے ہوتے ہوئے کمر تک لہرا رہے تھے۔

”ہوں!۔۔۔ لگی ہو۔ بہت کیا نام ہے؟“

”زینبہ! امی کی پسند ہے۔ ماسٹرز کیا ہوا ہے تمہیں پسند ہے؟“

”بہت پیاری ہے۔ بچے کی تمہارے ساتھ۔“

”زارا! یقین کرو کہ ابھی وقت ہے۔ میں امی کو منع کر سکتا ہوں۔ اپنے دل کی آواز سن لو۔ ورنہ اگلے ہفتے تک

ای مٹگنی کی رسم بھی طے کر دی گئی۔ انہیں برسوں سے میری شادی کی آس ہے جب کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔  
 ”فضول باتیں مت کرو امی نے بہت سوچ سمجھ کر ہی پسند کی ہوگی۔“ زارا نے لکھا۔  
 ”اوکے“

”تم بدل تو نہیں جاؤ گے شادی کے بعد؟“  
 ”کبھی نہیں۔۔۔ تمہارے لئے تو کبھی بھی نہیں۔“  
 ”ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔“

☆.....☆.....☆

ایک دفعہ اچانک ہی فیضان نے رائیل سے کہا۔  
 ”رائیل! اگر ناراض نہ ہو تو ایک بات کہوں؟“  
 ”ایسی کون سی بات ہے کہ تمہیں ایسا پوچھنا پڑا؟“  
 ”ایسی ہی ہے۔“  
 ”پوچھو۔“

”ایسے تھا تھا کب تک رہو گی؟ زندگی ایسے تو نہیں گزرے گی۔ تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“  
 ”شادی کرنا ضروری ہے کیا؟“

”ہاں! ورنہ تمہاری تنہائی تمہیں بار بار فرسٹریشن میں مبتلا کرتی رہے گی۔ تمہیں یہ فیصلہ کافی پہلے کر لینا چاہیئے تھا۔۔۔ خیر۔۔۔ اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا ہے۔“  
 ”میں بہت خوفزدہ ہوں شادی سے۔ میری شادی کا تجربہ آج بھی مجھے کسی بھیا تک خواب کی طرح لگتا ہے۔۔۔ میں تنہا نہیں ہوتی اگر آج میرا بیٹا میرے پاس ہوتا۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے تھے۔ فیضان نے بہت دکھ سے اسکی طرف دیکھا اور سوچا کہ کاش وہ اس سلسلے میں اس کے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو وہ اس کی مدد کر سکتا۔ وہ اپنی جگہ صحیح کہہ رہی تھی۔ اتنا عرصہ وہ اس کو دیکھ رہا تھا کہ اب وہ بھی سمجھ رہا تھا شادی اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک بار زندگی کی طرف لوٹ آئے تو وہ پھر سے ایک



بہت ہی ایکٹیو اور پوزیٹیو ممبر بن سکتی ہے سول سوسائٹی کی مگر زندگی کی طرف اسے لانے کے دو ہی راستے تھے یا تو بہت ہی چاہنے والا اور اسے سمجھنے والا اس سے شادی کرے، اس کا خیال رکھے اور اس کا اعتماد بحال کرے، یا پھر اسے اپنا بیٹا واپس لے۔

”سنو!“ اس نے رائیٹل کو دھیرج سے پکارا۔

”جی!“

”اگر تم سے پیار کرنے والا یا جس سے تم پیار کرتی ہو۔۔۔ وہ شادی کرنا چاہے تب بھی نہیں کرو گی؟“  
اس سوال پر وہ بس حیرانگی سے اسے دیکھتی ہی رہی۔ واقعی اس طرح تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ مگر سوچ سے کیا ہوتا ہے۔ ہر عورت ہی یہی چاہتی ہے اور جب اسے ایسا شخص مل جاتا ہے تو وہ فیصلہ لے لیتی ہے سوچتی نہیں۔

”ایسا کوئی شخص اب تک مجھے ملا ہی نہیں۔“ وہ بولی

”ہو سکتا ہے کہ تمہارے آس پاس رہا ہو مگر تم نے اپنے خول سے نکل کر اس کی طرف دیکھا ہی نہیں ہو۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے محبت تو محسوس ہو جاتی ہے۔“

”واقعی؟“

وہ ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا تو وہ بالکل گڑبڑا کر رہ گئی۔

اس رات جب وہ بستر پر لیٹی تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے بار بار فیضان کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ آج اس کا بولا ہوا ایک ایک لفظ، اس کا دیکھنا، اس کی بے تابی۔۔۔۔۔ خود۔۔۔۔۔ اس کی اپنی feelings اس کے لئے جنہیں وہ اب تک سمجھ نہیں پائی یا پھر سمجھ کر بھی انجان بنی رہی۔ آج اس نے دل سے پوچھا تو اس نے بھی گواہی دی۔

’میں نے جیسے شخص کے لئے اپنی ٹین اٹیج سے خاکہ بنایا تھا، فیضان اس میں فٹ آ رہا تھا۔۔۔ مگر میں نے کب سوچا تھا کہ اگر وہ مجھے ملے گا بھی تو اس عمر میں اور ایک ناکام شادی کے تلخ تجربے کے بعد۔۔۔۔۔! پھر۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ کیوں میں اب سنے بچنے لگی ہوں۔ یہ دل۔۔۔ اب مجھے کیوں کھینچنے لئے جا رہا ہے

اس کی طرف۔۔۔ اور۔۔۔ آج وہ کیوں بار بار مجھ سے شادی کے لئے کہہ رہا تھا۔۔۔ کہیں۔۔۔ کہیں وہ اس سے شادی کا خواہش مند تو نہیں۔۔۔؟؟ اگر ایسا ہوا تو۔۔۔؟؟ کیا میں انکار کر سکوں گی۔۔۔؟؟ کسی اور سے شادی کے لئے میں سوچ بھی نہیں سکتی مگر۔۔۔ ہاں۔۔۔ اقرار کرتی ہوں کہ میں تمہیں چاہتی ہوں فیضان۔۔۔!!

دل کی گہرائیوں سے۔۔۔۔

کچھ رات کو نیند نہ آنے کا سبب تھا اور کچھ یونیورسٹی میں اپنی کولیگ کا مسئلہ تھا کہ آج وہ بہت اداس اور تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ وہ حسب معمول شام کو کام مکمل کر کے جانے لگی کہ فیضان نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناں؟“ وہ بکھری بکھری رائیل کو دیکھتے ہوئے پریشانی سے بولا۔

”ہاں۔۔۔“

”پھر یہ چہرے پر بارہ کیوں بچ رہے ہیں؟“

”کوئی خاص بات نہیں۔“

”عام ہی سہی۔ بتاؤ تو۔۔۔“

رائیل کی آنکھوں سے دو شہمی موتی نکل کر گالوں پر بہنے لگے تو وہ بہت ہی پریشان ہو گیا۔ رائیل نے فوراً پرس سے ٹشو پیپر کے لئے تلاش شروع کی کہ اس نے نمبل پر پڑے ٹشو پیپر کے باکس سے ایک ٹشو پیپر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اس سے ٹشو پیپر لے کر فوراً آنکھیں خشک کیں اور اسے قریب رکھے ہوئے ڈسٹ بن میں پھینکنا چاہا تو وہ فوراً چیخ پڑا۔

”ارے۔۔۔ نہیں۔۔۔ ڈسٹ بن میں مت پھینکنا۔“

وہ گھبرا کر بولی۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”مجھے واپس کر دو میرا ٹشو پیپر۔“

وہ بولا تو اس نے بھی بے وقوفوں کی طرح فوراً اس کی طرف بڑھادیا۔

اس نے اسے بہت آرام سے تہہ کر کے اپنے جیب میں رکھ لیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ وہ حیران ہو کر بولی۔

”میوزیم میں رکھواؤں گا اسے۔“

”وہ کیوں؟“

”اس ٹشو پیپر میں میری دھرتی کی نامور حساس آرٹسٹ کے آنسو جذب ہیں۔“

وہ بولا تو وہ مسکرا پڑی۔

”اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟ کوئی مسئلہ ہے؟ آفس میں کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”مجھے گھر جانا ہے۔“ وہ کسی معصوم سی سکول گرل کی طرح بولی۔ یہی بات تو فیضان کو اس کی طرف کھینچ لائی

تھی۔ اس میں ہناوٹ نام کو نہیں تھی۔ ابھی تک وہ کوئی معصوم سی لڑکی دکھتی۔ اس دور میں وہ سب سے الگ اور منفرد لگتی۔

”ایسے تو میں بھی جانے نہیں دوں گا۔“

”دھونس؟“

”ہاں!“

”کوئی خاص بات نہیں میری ایک کو لیگ کے ساتھ گھریلو مسائل ہیں۔ آج اس نے جو کچھ بتایا وہ سن کر اس

کی تکلیف دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔“

دوسروں کی تکلیف پر تڑپ جانے والی معصوم سی رائیبل کو وہ دیکھ رہا تھا۔

”ایسا کیا ہو گیا اس کے ساتھ؟“

”بہت تفصیلی بات ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ چائے بھی منگوادوں۔“

کہتے ہوئے اس نے سچ مچ چائے کے دو کپ منگوائے۔

”میں اب تفصیل سننا چاہتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اس نے لو میرج کی تھی۔ شادی کے بعد وہ دونوں بہت خوش تھے بلکہ ایک دوسرے کے دیوانے تھے۔ لیکن پھر ان دونوں میں اختلافات ہونا شروع ہو گئے اور اب تو ان کے درمیان اس قدر فاصلے بڑھ چکے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی شکل سے بھی بیزار ہیں۔ وہ اکثر بہت پریشان رہتی ہیں گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے مگر آج کل ان کے شدید اختلافات کا سبب یہ ہے کہ اس کا شوہر کسی اور لڑکی کے چکر میں ہے اور وہ شدید insecurity کی حالت میں ہے کہ اگر اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا تو اس کا اور بچوں کا کیا ہوگا؟ تبھی تو میں کہتی ہوں کہ شادی بھی تو عورت کو تحفظ نہیں دے سکتی نہ ہی شادی کرنے سے سب مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔“ فیضان اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات کو غور سے دیکھ رہا تھا، اس کی بات ختم ہونے کے بعد وہ بولا۔

”اگر ان کے درمیان اب بھی محبت ہے تو insecurity کی فیلنگز ہونی نہیں چاہیے۔ کیونکہ کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں، محبت کرنے والے ایک دوسرے کو چھوڑتے نہیں۔ جن دلوں میں محبت ہو وہاں بیزاری اور نفرت کے لئے جگہ ہی نہیں ہوتی۔“

”محبت ہوتی تو وہ اپنی پہلی محبت کو جواب اس کے بچوں کی ماں بھی ہے کے ہوتے ہوئے کسی دوسری لڑکی کے چکر میں پڑتا؟“

”رائیل! بات دراصل یہ ہے کہ شادی سے پہلے جو نو جوان پیار اور انڈر شینڈنگ کا دعویٰ کرتے ہیں وہ درحقیقت محبت کی حقیقت جانتے ہی نہیں۔ وہ محض اپنی مرضی کے جیون ساتھی کا انتخاب کرتے ہیں کیونکہ شادی سے پہلے وہ صرف اور صرف پیار بھری باتیں ہی کرتے ہیں مگر شادی کے بعد وہ نہ صرف پریمیوں سے شوہر اور بیوی بن جاتے ہیں مگر شادی کے بعد کے مسائل جب ان کے سامنے آتے ہیں تو پیار و محبت کا طلسم جیسے ایک چھنا کے سے ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ اسی لئے میرا فلسفہ بھی یہی ہے کہ سچی محبت کرنے والوں کو شادی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ عشق تو نازک سے رنگین جذبوں سے بنا ہوا وہ حصار ہے جس پر شادی کا پتھر گرنے سے وہ تار تار ہو



جاتا ہے۔ میں شاہ لطیف کے ایک بیت کے مفہوم سے متفق ہوں کہ۔

میں ڈھونڈوں، مگر اے کاش!

میری جستجو ناتمام ہی رہے

کہیں ایسا نہ ہو

کہ

تمہیں پا کر میرے جذبے ماند پڑ جائیں۔

”مطلب؟“ رائیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ عشق جیسے آفاقی جذبے کو محض گھر کے اخراجات کے حساب کتاب، یوٹیلیٹی بلز کی payment کی پریشانیوں اور بچوں کے تعلیمی مسائل کے حوالے کر دینا میرے نزدیک بہت بڑا ظلم ہے۔“

اس کی بات سن کر رائیل حیران ہو گئی اسے لگا کہ اس کے اندر بھی ایک چھنا کا سا ہوا وہ بولی۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو فیضان مگر طلسم اور خوابوں میں رہنے کا بھی ایک دور ہوتا ہے۔ ساری عمر نہیں۔ اس لئے جس سے محبت کی جائے اسی سے شادی کی جائے۔ یہ کیا کہ جس سے محبت کرو اسے غیر کے حوالے کر دو اور خود بھی اس سے شادی کرو جس کے لئے محبت کا جذبہ ہو ہی نہیں۔ ہاں، عشق کرنے والی داستانوں میں بھی یہی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کو اپنا نا چاہتے تھے مگر لوگ یا معاشرہ رکاوٹ بنا اور ان کو جدا کر دیا تھا۔ ہمیں بھی حقیقت پسند ہو کر سوچنا چاہیے پھر چاہے وہ حقیقت تلخ ہی کیوں ہوں۔“

وہ بولتی رہی اور وہ مسکرا کر اسے ستارہا کیونکہ آج پہلی مرتبہ وہ اس سے بحث کر رہی تھی اور دلائل دے رہی تھی۔ وہ اسے کھولنا چاہ رہا تھا۔ وہ بولتی گئی۔

”میں خود کسی زمانے میں اسی فلسفے کی قائل تھی لیکن اب میری سوچ بدل گئی ہے۔ کبھی عمر کی سوچوں اور مچھور ذہن کی سوچوں میں فرق ہوتا ہے۔ آج میں سوچتی ہوں کہ عاشق اور معشوق ساری عمر کیا محض ایک دوسرے کے لئے آہیں بھرتے ہوئے گزار سکتے ہیں؟۔۔۔ زندگی کے تلخ تجربوں سے گزرنے کے بعد اب میں سمجھ چکی ہوں کہ جس سوسائٹی میں ہم رہتے ہیں، وہاں ایک اکیلی عورت کے لئے قدم قدم پر جہنم ہے۔ اور پھر جہاں

تک محبت کی بات ہے تو ہم جس سماج کے باسی ہیں وہاں ایک مرتبہ کسی عورت کا نام کسی مرد کے نام سے جڑ جاتا ہے تو جب تک اس تعلق کو شادی کے مضبوط بندھن میں نہیں باندھا جاتا تو وہ عورت بدنام ہو جاتی ہے۔ اور پھر۔۔۔ اس مرد کی محبت کیا کیسا دعویٰ ہے کہ وہ اسے اپنانے کے بجائے معاشرے میں بدنام ہونے کے لئے چھوڑ دے۔۔۔؟ کیا وہ ایسا چاہے گا؟ کیا وہ اسے محض اسکیٹل کے حوالے کر کے بھونکتے ہوئے خونخوار کتوں کے آگے ڈال دے گا؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ اگر اس کے پیار میں سچائی ہے تو وہ اسے تحفظ دے گا، اپنا نام دے گا، اعتماد دے گا اور عزت سے اپنے گھر لاکر ایک اونچا مقام دے گا۔“

”کمال ہے آرٹسٹ ہونے کے باوجود بھی تم ایک عام عورت کی طرح سوچتی ہو؟ تمہاری سوچ تو منفرد ہونی چاہیے، پھر تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اس سوسائٹی کے نام نہاد شرفاء کے اپنے دامن کتنے داغدار ہیں؟ یاد رکھو، زندگی صرف ایک مرتبہ ہی ملتی ہے، اسے اپنی مرضی سے گزارو، لوگوں کی مرضی سے نہیں کیونکہ تم چاہے کتنی ہی پارسائی کی زندگی گزارو، یہ سماج تمہیں کوئی اعزاز یا شوقیٹ نہیں دے گا۔“

”مجھے اس سماج کے لوگوں سے کوئی اعزاز یا شوقیٹ چاہیے بھی نہیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے اپنے دامن کو کچھڑ میں رہتے ہوئے بھی بچائے رکھا ہے۔ اس پر کوئی داغ نہیں ہے۔“

ایکدم سے ٹیلیفون کی تیز رنگ نے ماحول کو بدلا۔ فیضان نے کال سن کر کہا۔

”نہیں! اس وقت کسی کو مت بھیجیں۔ میں ایک ضروری میٹنگ میں ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”سوری! میں نے تمہارا بہت ٹائم لے لیا آج۔ تم کام کرو میں جا رہی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی تو اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”بیٹھو!“

وہ کسی رو بوٹ کی طرح بیٹھ گئی۔ فیضان نے بڑی مشکل سے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو ہونٹوں میں دباتے ہوئے کہا۔

”میرے سامنے سچ بولنا اب۔ تمہاری اداسی کا اصل سبب بتاؤ۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

”مجھے تمہارے رویے نے ڈسٹرب کیا ہے۔“

”میرے رویے نے؟ کیا کیا ہے میں نے؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”میں تو اپنے حالات سے کپرومانز کر چکی تھی مگر تم نے آکر سب گڑبڑ کر ڈالا۔“

”کیا کپرومانز کیا تھا؟ یہ کہ مسکن دوائیں کھا کر خود کو بیگانہ کر دو؟ اپنے ٹیلنٹ اور طاقت کو زنگ لگا دو؟ کیا

ڈسٹرب کیا ہے میں نے۔۔۔ یہ۔۔۔ کہ۔۔۔ میں تمہیں نکال رہا ہوں اس صورت حال سے؟“

”تمہارے غیر واضح رویے نے مجھے عجیب و غریب ذہنی کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے۔“

”اگر تم ڈرنے کے بجائے بولڈ ہو کر میرے ساتھ چلو، بات کرو تو سب واضح ہو جائے گا۔ ہمت ہے تم

میں؟“

”میں کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتی۔“

”پھر تم مجھے بھی کوئی الزام مت دو۔“ آج وہ بھی جیسے فیصلے کے موڈ میں تھا۔ وہ اسے خوف کے دائرے سے

نکلانا چاہتا تھا مگر وہ خود تیار ہی نہیں تھی۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہی رٹ تھی اس کی۔

”جاؤ۔ مگر اپنی مرضی سے دروازہ کھلا ہے۔“

وہ اٹھ کر چل دی اور فیضان کے چہرے پر بہت ہی دکھ اور مایوسی کے تاثرات آگئے جسے رائیل دیکھ نہیں سکتی

تھی۔ وہ تو جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

”زارا! ہم لوگ تھوڑی دیر میں نکل رہے ہیں مگنی کی رسم کے لئے۔“

علی حیدر نے زارا کو کال کر کے بتایا۔

”تمہاری خوشیوں کے لئے ڈھیر ساری دعائیں!“

”میں نے اس وقت وہی سوٹ پہنا ہوا ہے جو تم نے مجھے گفٹ کیا تھا۔“

”ارے واہ!“

”میں چاہتا ہوں کہ اپنی نئی زندگی کی ابتدا تمہارے دیئے ہوئے گفٹ سے کروں۔“

”یہ سن کر مجھے اور بھی خوشی ہوئی۔۔۔“

”زارا۔۔۔ سنو۔۔۔“

”جی!“

”یاد رکھنا کہ میرے دل کی رانی تم ہی رہو گی۔ ہمیشہ جب تک میں زندہ ہوں۔۔۔ کوئی بھی تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔۔۔ کوئی بھی۔۔۔“

اس کی آواز بھرا سی گئی اور اس نے کال کو ڈسکنیکٹ کر دیا۔

زارا کپکپا سی گئی۔ اس کی باتیں سن کر وہ عجیب سے احساس میں گھر گئی۔۔۔ جیسے کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو۔۔۔۔۔ جیسے کوئی دیپ بجھنے کا احساس۔۔۔۔۔

☆.....☆.....☆

عید کا دن تھا نہ جانے کیوں اس مرتبہ رائیل نے عید کے لئے نیا جوڑا لیا اور اس مرتبہ تیار ہوئی اور کچن میں بھی گئی۔ اتنے عرصے بعد اس نے کوئی نئی ڈش ٹرائی کی تھی ترکیب پڑھ کر۔ صبح سے شام ہو گئی مگر فیضان کی کال نہیں آئی تھی۔ اس کے کان موہائل ٹون پر لگے رہے یہاں تک کہ شام بھی ہو گئی مگر نہ اس نے کوئی فیکسٹ میج کیا نہ ہی کال اس نے ادا اس ہو کر سوچا۔

”میرے لئے کوئی خوشی کیوں نہیں ہے؟ کوئی چھوٹی خوشی بھی نہیں کہ آج وہ اسے کال کرتا؟ کال یا میج کیا ہوتا ہے؟ یہ احساس کہ اسے یاد رکھا گیا اس کا مطلب ہے کہ میں اسے یاد ہی نہیں۔ اور وہ کیوں یاد کرے؟ وہ تو دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں مصروف ہو گا۔ وہ تو ایک بھرپور زندگی گزار رہا تھا یقیناً اسے چاہنے والیاں بھی ملی ہوں گی اور۔۔۔ شاید اس نے بھی کسی کو چاہا ہو۔ پھر وہ تو عرصے سے امریکہ میں رہ رہا تھا۔۔۔ وہاں کے آزاد ماحول میں اس نے بھرپور زندگی گزاری ہو گی اس لئے رائیل کا پیار اس کے لئے محض اضافی چیز ہو گا۔ مگر میری زندگی میں وہ میرے لئے سب سے اہم ہستی بن چکا ہے۔“

رات ہو گئی تو جیسے اس کے دل میں بھی اندھیرا ہو گیا۔ اس کا دل بھر آیا اور وہ خوب روئی پھر اپنا حلیہ درست



کرنے کے لئے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے بالوں کی لٹیں بکھر کر اس کے چہرے کے گرد آ گئی تھیں۔ آنکھوں کا کاجل رونے کی وجہ سے ہلکا ہو گیا تھا اور لپ اسٹک فیڈ ہو چکی تھی۔ اس نے سونے کی باریک مگر بڑی بالیاں اتاریں جو اس پر بہت سوٹ کرتی تھیں اس نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا اور منہ دھونے کے لئے واش روم کی طرف جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ فیضان کی کال آ گئی۔

”عید مبارک!“ اس نے چپکتے ہوئے کہا تو وہ اس کی آواز سن کر رو پڑی تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔

”رائیل!۔۔۔ مت روائیے۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ پلیز۔۔۔“

”تمہیں فرصت مل گئی؟ یاد آ گئی میں؟“ اس نے شکوہ کیا۔

”ارے بھی، بات یہ ہے کہ قربانی والی عید میں اپنے آبائی گاؤں میں ہی کرتا ہوں اپنی آبائی حویلی میں۔ پھر سارا دن گوشت کے لوگ اپنے مسائل لے کر بھی آتے ہیں۔ یہاں پر سکنلز بھی صحیح نہیں آتے ورنہ میں نے دو تین بار پہلے بھی ٹرائی کیا تھا۔ اچھا کل میں فون کروں گا اور پھر ہم بہت ساری باتیں کریں گے۔ اپنا خیال رکھنا۔“

”اوکے۔“ رائیل نے کہا۔

مگر اس نے دوسرے دن بھی رابطہ نہیں کیا اور تیسرے دن بھی۔ وہ بہت مس کر رہی تھی اسے۔ اس شام اس نے ڈائری اٹھائی اور لکھتی گئی۔

میرے محبوب، میرے ہمد!

ایک بار میں نے

پوچھا تھا کہ

”میرے مستقبل کا

فیصلہ سناؤ“

تم نے کہا تھا

”یہ ہم وقت پر

چھوڑ دیتے ہیں

کہ وہ کیا فیصلہ

دیتا ہے۔“

اور

آج تک۔۔۔۔

وقت نے

اب تک کوئی

فیصلہ نہیں دیا

بلکہ۔۔۔۔

قدم قدم پر

مجھے پیچھے دھکیل رہا ہے

میرے سامنے!

یاد رکھنا

وقت

ریت کی طرح

مٹھی میں سے

پھیل جائے گا

تمہاری

مجبوریوں کا

کوئی انت نہیں ہے

مگر

زندگی کا

انت

آجاتا ہے!

اس نے ڈائری بند کر کے سوچا کہ اسے اپنی عادت بدلنا ہوگی۔ وہ انتظار نہ کرے فیضان کے رسپانسز کا اور اس سے اتنی امیدیں وابستہ نہ کرے۔ کہ شاید لوگ ہمیں دکھ نہیں دیتے مگر ان سے وابستہ امیدیں پوری نہ ہوں تو ہمیں دکھ ہوتا ہے۔

عید کے بعد وہ آفس گئی۔ آج کل وہ بہت مصروف ہوتا تھا اور کبھی تو آفس ٹائم کے بعد بھی دیر تک کام کرتا تھا۔ ایک دو دن گزر گئے اس نے ایک مرتبہ بھی اسے بلا کر ایکسکیوز نہیں کیا کہ وہ وعدہ کرنے کے باوجود کیوں بات نہ کر سکا۔ پھر اس نے دوسرے دن چھٹی کر لی مگر اس نے کال کر کے نہیں پوچھا۔ اس نے دوسرے روز پھر چھٹی کی۔ اس شام اس نے کال کر کے پوچھا۔

”تم آفس کیوں نہیں آرہیں؟“

”شکر ہے آپ کو یاد تو آئی میری۔“

اس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

”کیوں ناراض ہو؟“

”اپنی بیوقوفی کی وجہ سے۔“

”مطلب؟“

”کہ تم وعدہ کرتے ہو اور میں اعتبار کر لیتی ہوں۔ کال کرنے کا وعدہ۔“

”رائیل! تم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بیٹھ جاتی ہو۔“

”یہی تو مصیبت ہے کہ جو بات عورت کے لئے بہت بڑی ہوتی ہے وہ تم مردوں کے لئے بہت معمولی ہوتی

ہیں اور جن کو تم اہم سمجھتے ہو۔ ہمارے لئے غیر اہم ہوتی ہے۔“

”اور تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ تم بعض اوقات مجھے کتنا ہرٹ کرتی ہو؟“

”میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“

”اس دن تم نے جو کہا تھا کہ میری وجہ سے تم ڈسٹرب ہوئی ہو۔ اور پھر اپنی مرضی سے تم اٹھ کر چلی گئیں۔ تم نے کبھی میری feelings کا احساس کیا ہے؟“

وہ لا جواب ہو گئی اور خاموش ہو گئی تو وہ دوبارہ بولا۔

”ہاں! میں نے تمہاری زندگی کو ڈسٹرب کیا ہے کیونکہ وہ ٹھہرے ہوئے سنولائے ہوئے پانی کی طرح تھی۔ میں نے اس میں تبدیلی کا بھاری پتھر پھینکا تو اس میں ہلچل مچ گئی۔ کیوں نہیں اپنی دل کی بات سنئیں اور اقرار کرتیں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ تمہیں اب میری محبت بھی ملی ہے تو تم چوہین کو فیس نہیں کر پار ہیں۔ میں تمہیں آبخار کی طرح دیکھنا چاہتا ہوں مگر تم۔۔۔۔۔“ وہ چپ ہو گیا۔

”بھی تم تو ادیب ہو، لفظوں کے کھلاڑی۔۔۔۔۔ میں کہاں تم سے مقابلہ کر سکتی ہوں بھلا۔“

”تم مجھ سے باہر کہیں کیوں نہیں ملتیں۔ ہم کچھ وقت ساتھ بتائیں۔ ایک دوسرے سے دل کی باتیں شیئر کریں۔“

”عورت صرف اسی سے ریلیکس ہو کر اس طرح مل سکتی ہے جب اسے یقین ہو کہ اس سے محبت کرنے والا اس کو اپنائے گا بھی۔ کم از کم میری طرح سوچنے والی۔“

”تمہاری سوچ کی سوئی ایک ہی جگہ ایک کر رہ گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کسی اور پر ڈپنڈ کرنے کے بجائے اپنے اندر اعتماد پیدا کرو۔“

”تو پھر مجھے شادی کا مشورہ کیوں دیتے ہو؟ سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تم میں اور ریاض میں کیا فرق ہوا؟ وہ نو جوان راتیل کو قبول نہ کر سکا جب کہ تمہارے سامنے تو 30 کی راتیل ہے اور وہ بھی طلاق یافتہ اور ایک بچے کی ماں۔۔۔۔۔“

یہ کہہ کر اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی اور پھر موبائل ہی آف کر کے پنگ پر پھینک کر رونے لگی۔

☆.....☆.....☆

ویک اینڈ تھارات کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ نیچے سب سو چکے تھے۔ لاؤنج میں بوا بھی سو رہی تھیں۔ اکیلی زارا اپنے بیڈ سے ٹیک لگائے ٹی۔ وی پر ایک مووی دیکھ رہی تھی اچانک واٹس ایپ پر میسجز کی



ٹون آئی۔ زارا نے سیل فون اٹھا کر چیک کیا علی حیدر نے منگنی کی کچھ تصویریں بھیجیں تھیں۔ وہ اور زینہ ساتھ بیٹھے تھے۔ علی حیدر نے اسے اور اس نے علی حیدر کو انگلی پھنائی۔ زینہ میک اپ، منگنی کے جوڑے اور خوبصورت ہینر اسٹائل میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ علی حیدر زارا کے گفٹ کیے ہوئے سوٹ میں بہت ڈینٹ لگ رہا تھا۔ لڑکی بہت خوش لگ رہی تھی جب کہ علی حیدر بہت سویرا اسٹائل میں وحشی مسکراہٹ سجائے ہوئے تھا۔ دونوں فیملیز بہت خوش تھیں۔

”بہت بہت مبارک ہو!“ زارا نے لکھا۔

”پھرٹی۔ وی بند کر کے لائٹ آف کر دی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ علی حیدر اور وہ صرف اچھے دوست تھے۔ برسوں پرانا رشتہ تھا۔ اس سے، شاہد ندیم، فواد احمد اور لائبر سے۔ اب اگر وہ شادی کرے گا تو ان کی دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ شاید فواد اور لائبر تو بہت ہی کم رابطے میں رہے مگر علی حیدر جب سے اس کی زندگی میں دوبارہ آیا تھا وہ اس کا بہت خیال رکھتا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے کام آتے۔ دکھ سکھ شیر کرتا۔۔۔ مگر۔۔۔ شادی کے بعد وہ بدل تو نہیں جائے گا۔ پھر اسے اپنی ہی سوچ پر ہنسی آئی۔ بھلا وہ اس کے آنے سے پہلے بھی تو جی رہی تھی۔ اگر بدل جاتا ہے تو اسے کیا فرق پڑے گا؟ وہ حسین تھوڑی تھا جس کے حوالے سے اس نے مستقبل کے خواب دیکھے تھے۔ علی حیدر کے لئے تو ایسا کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ ایسی باتیں وہ سوچتی ہوئی سو گئی۔

☆.....☆.....☆

جب رائیل کو پتہ چلا کہ آرٹس کونسل میں گرینڈ آرٹ شوکی اوپننگ کی رپورٹنگ کے لیے فیضان نے کسی اور کو بھیجا ہے تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ فیضان کے آفس میں پہنچ گئی۔ وہ بہت غصے میں تھی۔

”فیضان!“

”رائیل! اگر کوئی ضروری بات نہ ہو تو ہم رات کو فون پر بات کر لیں گے یا پھر کل۔ اس وقت میں ضروری کام میں مصروف ہوں۔“

”کل سے میں آفس ہی نہیں آؤں گی۔“

فیضان لکھتے لکھتے رک گیا اور اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا  
”کیوں؟ کیا ہوا ہے؟“

”آپ بہت مصروف ہیں اور میں تفصیلات میں جا کر آپ کا وقت برباد نہیں کروں گی۔“  
یہ کہتے ہوئے وہ آفس سے نکل گئی اور فیضان اسے پکارتا ہی رہ گیا۔

رات کو اس نے رائیل کو کال کی تو وہ نمبر دیکھ کر چونک گئی۔ وہ اسے آفس کے نمبر سے کال کر رہا تھا۔ وہ ابھی  
تک آفس میں ہے؟ نو بجنے والے تھے۔

سلام دعا کے فوراً بعد رائیل نے کہا۔

”فیضان! تم اب تک آفس میں ہو؟ کیوں اتنا کام کرتے ہو؟“

”آج کل صرف پرچے کا کام نہیں ہے بلکہ کچھ دوسرے کاموں کو نمٹا رہا ہوں۔ اپنی مصروفیات میں بھی تم کو  
نہیں بھول سکتا۔“

”ہاں!۔۔۔ مگر اکثر بھول بھی جاتے ہو۔ وہ وقت ہی گزر گیا جب تم میرا ’ہیلو‘ کہنا سن کر بے چین ہو گئے  
تھے۔ اب تم مجھے اکثر انکوار کرنے لگے ہو خیر۔۔۔ میں کون ہوتی ہوں تم سے شکایت کرنے والی۔ کون سا رشتہ  
ہے میرا تم سے؟“

”تم میری محبت کا یہ صلہ دے رہی ہو مجھے؟ میں تم سے کیا کیا کہنا چاہتا ہوں، یہ تم کیا جانو۔ مگر میں نے جب  
بھی ایک قدم آگے بڑھایا تو تم دو قدم پیچھے ہٹ جاتی ہو۔“  
اس کا لہجہ بہت دکھی تھا پھر وہ بولا۔

”آج کس بات پر اس قدر نفرتا تمہیں؟“

”تم نے مجھ سے پوچھے بغیر رضوان کو کیوں بھیج دیا تھا آرٹس کونسل والے شو کی رپورٹنگ کے لئے؟“  
”اوہ، تو تم اس بات پر ناراض ہو۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں انڈس آرٹس سرکل والے شو میں بھیجنا چاہا تھا  
تب تم نے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے میں نے سمجھا کہ تم نہیں ہو انٹرنیشنل اس کام میں۔“

”فیضان! تمہیں اچھی طرح یاد ہو گا کہ جب تم نے پہلی مرتبہ مجھ سے رابطہ کیا تھا تب میں بالکل گمنامی میں

چلی گئی تھی اور شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ تم مجھے اس اندھیرے سے روشنی کی طرف لے کر آئے ہو۔ یہ سچ ہے کہ میں اپنا اعتماد کھو چکی تھی لیکن اب تو میں کافی حد تک بدل چکی ہوں۔ انڈس آرٹ سرکل کی رپورٹنگ کورفیوز کرنے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ اگر میں ایسے ہی گھبراتی رہی تو ساری عمر پہلے والی پر اعتماد اور ایکٹیو رائٹل نہیں بن سکتی۔ اس لئے میں نے اس شو کی کوریج کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ رضوان کو بھیجنے سے پہلے ایک مرتبہ مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ اگر میں پھر منع کر دیتی تو بھیج دیتے اسے۔“

”پھر تم مجھ سے اپنی باتیں شیئر کیوں نہیں کرتیں؟ تم نے لوگوں کے خوف سے میرے پاس آ کر بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ ایسے کیسے گزرے گی زندگی؟ مجھے پتہ ہے کہ تم بھی میرے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہو، گھومنا پھرنا چاہتی ہو مگر تم خود پر جبر کرتی ہو۔۔۔۔۔ بلکہ ظلم کرتی ہو۔۔۔۔۔ اور لوگوں نے تمہیں اس کا کیا صلہ دیا ہے؟“

”میں کل سے آفس نہیں آؤں گی۔“

”تمہیں آنا پڑے گا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

”اگر نہیں آئی تو۔۔۔۔۔“

”دیکھ لو گی نتیجہ“ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ وہ حیران و پریشان رہ گئی۔

دوسرے دن رائٹل پر پھر پرانا یا سیت کا دورہ پڑا۔ وہ یونیورسٹی میں بھی فل ٹائم بیزار سی رہی۔ گھر پہنچ کر بمشکل چند نوالے کھانے کے کھا سکی۔ وہ سونا چاہتی تھی۔۔۔ ایک پرسکون نیند۔ لیکن نیند نہیں آرہی تھی آج اس نے کافی دنوں کے بعد مسکن دوا کی ڈوز لی اور کچھ دیر بعد اس کی بے چینی ختم ہونے لگی اور اس کا ذہن ہلکا پھلکا ہو کر نیند کی وادیوں میں ایسا گم ہوا کہ شام دیر سے آنکھ کھلی۔ وقت دیکھا تو مغرب ہونے والی تھی کمرے میں اندھیرا سا چھا چکا تھا۔ وہ انٹھی لائٹ کھولی اور فریش ہو کر بال درست کئے۔ فیضان کے آفس جانے کا ٹائم کب کا نکل چکا تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے فیضان کی رات کی کہی ہوئی بات سوچنے لگی۔ اچانک اس کی نظر موبائل کی اسکرین پر پڑی۔ فیضان کی کئی مسڈ کالز نظر آئیں۔ سیل 'سائلنٹ' پر رکھا ہوا تھا کیونکہ وہ سونا چاہتی تھی۔ اس وقت وہ خود کو بہت فریش محسوس کر رہی تھی۔

اس نے فیضان کو کال کی اور سوری کی کہ وہ دوائیوں کے زیر اثر سو رہی تھی اور موبائل سائلنٹ کے آپشن پر

رکھا تھا۔ اس لئے اس کی کالز اٹینڈ نہ کر پائی تھی۔ یہ سن کر اس نے دکھی ہو کر کہا۔

”تم پھر سے دواؤں کی عادی ہو رہی ہو۔ تم فراریت کا راستہ اختیار کر رہی ہو۔“  
”ناارض ہو گئے؟“

”تمہیں پرواہ ہے میری ناراضگی کی؟“

”ہاں بہت پرواہ ہے۔ پھر صرف لفظوں سے تو ہر بات کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ میں بھی بے حس نہیں ہوں۔“

”آج اسی لئے نہیں آئیں؟“

”آج تھک گئی تھی سونا چاہتی تھی۔ ہاں شاید دو دھنستے نہ آسکوں کیونکہ یونیورسٹی میں کل سے امتحانات شروع ہو رہے ہیں۔“

”کوئی مسئلہ نہیں تم کوئی باقاعدہ ورکر نہیں ہو آفس کی۔ بس اپنا خیال رکھنا۔“

”تم بھی آرام کرو کچھ۔ مت تھکاؤ خود کو۔“

”جو حکم سائیں!“

پھر وہ دونوں ہنس پڑے۔

☆.....☆.....☆

”میں نے تمہارا تعارف کروایا ہے زیبہ سے۔ وہ تمہیں فرینڈ ریکویسٹ بھیجے گی۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بہت اچھے طریقے سے بتایا ہے کہ وہ تو بنادیکھے تمہاری فین بن گئی ہے۔“  
علی حیدر نے زارا سے کہا۔

”اچھی بات ہے ریکویسٹ بھیجتی ہے تو ایڈ کر لوں گی۔ اس کا مطلب ہے کہ رابطہ ہے تم دونوں کا۔۔۔ بہت باتیں ہوتی ہوں گی دل کی۔۔۔“

”ہاں۔۔۔!“

”اچھا یہ بتاؤ کہ شادی کب ہے؟“



”امی زور و شور سے تیاری کر رہی ہیں۔ چھ ماہ بعد ڈیٹ ملی ہے۔“

یوں وہ پہلے کے انداز میں ہی بات کرتے لڑتے جھگڑتے۔ زیبہ نے اسے ریکویسٹ بھیجی تو اس نے ایڈ کر لیا۔ اس نے اس کے اکاؤنٹ پر منگنی کی تصویریں شیئر کی ہوئی تھیں جس پر اس کی فرینڈز کی ڈھیروں مبارک بادیں لگی تھیں۔ اس نے بھی مبارکباد لکھی۔ علی حیدر نے اپنے اکاؤنٹ پر ایسی کوئی پوسٹ نہ رکھی نہ ہی منگنی کی اطلاع دی زیبہ اپنی تصویریں شیئر کرتی رہتی تھی۔ بہت ہی خوبصورت تھی اور فیشن کی دلدادہ۔ نئے نئے ہیئر اسٹائل اور ڈریسز۔

زارا کو اس بات پر حیرت ہوتی کہ زیبہ تو کیا اکثر ادیب اور ادیبائیں اپنی تصویریں ہی شیئر کرتیں اور ڈھیروں جن پر مردوں کے ڈھیروں لائیکس ہوتے اور کمنٹس ہوتے۔ زیبہ تو گھریلو لڑکی تھی اس کے پاس صرف اس کی سہیلیاں اور رشتے دار ایڈ تھے۔

زارا صرف ادبی پروگراموں میں شرکت والی یا کام کے متعلق ہی اپنی ایک دو تصویریں شیئر کرتی ورنہ بیشتر تو وہ روزمرہ کے اہم ایڈز پر لکھتی اور اس کے فالوورز سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ زیبہ بھی اس کی پوسٹوں کو لائیک کرتی اور اچھے کمنٹس دیتی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس دن رائٹل نے غصے میں بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ بعد میں سوچا تو بہت شرمندہ ہوئی۔ دوسرے دن وہ کام سے فارغ ہو کر فیضان کے پاس خاص طور پر سوری کرنے کے لئے گئی۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے اداس مسکراہٹ سے کہا

”فیضان! تم بہت جھکے جھکے سے لگ رہے ہو۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“

”ہاں! بس آج کل بہت دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے آفس میں۔ پرچہ آخری مراحل میں ہے اب۔“

”کیوں تھکاتے ہو خود کو۔ اپنا خیال رکھو اور آرام کرو۔“

”او کے سرکار! اور کوئی حکم؟“

”حکم نہیں التجا ہے کسی پیار کرنے والے کی طرف سے۔“

”اچھا! میں تو تمہاری طرف سے سمجھا۔“

وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا پھر کہا۔

”پیار کرنے والی جب تک یہ مشورہ نہیں دے گی تب تک عمل نہیں ہوگا۔“

وہ اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا پھر سنجیدہ ہو کر کہا۔

”آج تم الحمر آرٹ گیلری میں ہونے والی نمائش کی کوریج کے لئے جا رہی ہو؟“

”ہاں۔ میں جا رہی ہوں۔“

”گڈ۔ تمہیں گاڑی بھی ملے گی اور فوٹو گراف بھی تیاری کر لو۔“

”اوکے۔“ وہ تھوڑا رکی پھر کہا۔

”مجھے پتہ چلا ہے کہ جب میں چشموں پر تھی تو تمہاری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اور تم پہلے سے کمزور اور

تھکے تھکے سے لگتے ہو۔“

”خبر رکھنے سے ہی پتہ چلا ہے۔ تم نے میری کتنی خبر گیری کی ہے؟“

وہ شرمندہ ہو کر بولی۔

”تم ہی بتا دیتے۔“

”بھئی، اب نزلہ، زکام بخار کسے نہیں ہوتا؟ اس میں بتانے والی کیا بات ہے؟ تم پریشان مت ہو۔“

”اوکے۔ میں جانے کی تیاری کرتی ہوں۔“

رائیل رپورٹنگ کر کے لوٹی تو اسے دیر ہو چکی تھی۔ وہ رات کو گھر پہنچی اور فیکسٹ میسج کر کے فیضان کو

اطلاع دی کہ وہ گھر پہنچ چکی ہے۔ اس نے فوراً کال کر کے پوچھا۔

”کیسا رہا ہو؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں حیرت ہے مجھے لگا ہی نہیں کہ اتنے سالوں کے بعد دوبارہ ایسی ایکٹوٹیٹ میں آئی ہوں۔“

”گڈ۔ مجھے تو شروع سے ہی پتہ تھا کہ تم بہت ٹیلیٹو ہو۔ اب ریٹ کرو۔“

”تم بھی اپنا خیال رکھو فیضان۔“

”کیوں۔۔۔؟ کس کے لئے۔“

”میرے لئے۔۔۔۔۔“ کہہ کر اس نے کال ختم کر دی اور مسکرا دی۔

☆.....☆.....☆

ویک اینڈ پر حسب معمول زارا فیس بک پر اپنے پیج کو اپ ڈیٹ کر رہی تھی کہ ایک فرینڈ ریکویسٹ آئی۔ نام دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ حسین سید کی ریکویسٹ تھی۔ اس نے اس کا پروفائل فوٹو دیکھا۔ بہت بدل گیا تھا گھنے بالوں والے ہمیشہ اسٹائل کے بجائے چھوٹے بال جواب گھنے نہیں رہے تھے۔ چہرے پر میچورٹی تھی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔ عجیب شش و پنج میں تھی۔ اتنے عرصے بعد اس طرح سے ریکویسٹ دیکھ کر وہ سوچنے لگی اب وہ اس سے کیوں رابطہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کا پروفائل چیک کیا۔ پبلک پوسٹس تھیں کوئی خاص اور اہم پوسٹس نہیں تھیں۔ جن پر چند لائیکس تھیں۔ وہ ادب میں کوئی خاص مقام نہیں بنایا تھا۔ یا شاید اپنے پروفیشن کی وجہ سے کم ٹائم دے پایا ہوگا۔ کورفوٹو پر اس کی نئی شاعری کی کتاب کا ٹائٹل تھا۔

”پلیز ایڈی۔“ اس نے پیج کیا۔

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“ زارا نے جواب لکھا۔

”بہت کچھ کہنا ہے۔ بہت کچھ بتانا ہے۔“

”میں آپ کو ایڈ کر رہی ہوں مگر نہ مجھے کچھ سنا ہے نہ کہنا۔“

یہ کہتے ہوئے زارا نے اسے ایڈ کر لیا۔ جان بوجھ کر تا کہ وہ اس کی وال پر اس کی کامیابیاں اور اس کی اہم حیثیت دیکھ سکے کہ وہ اس کے جانے کے بعد ختم نہیں ہوگئی۔ اب وہ تو اکثر اس کی پوسٹس لائیک کرتا مگر اس نے کوئی بھی اس کی پوسٹ لائیک نہیں کی۔ وہ اکثر چیٹ میں ہیلو ہائے وغیرہ لکھتا مگر اس نے کبھی کوئی جواب نہیں دیا ایک بات جو زارا نے محسوس کی کہ وہ فیس بک کو بہت ٹائم دیتا تھا۔ حالانکہ پوسٹس کم کرتا تھا۔ زارا شام کو تھوڑی دیر کے لئے ہی آن لائن ہوتی محض اپنے پیج اور اکاؤنٹ کے نوٹیفیکیشن دیکھنے کے لئے اور نیوز فید دیکھتی کہ اندازہ ہو کہ ہم عصر ادیب اور ادیباء کی سرگرمیاں دیکھ سکے۔ اس کا پیج بہت کامیاب جا رہا تھا۔ اس کی تصویریں بہت پسند اور شیئر کی جا رہی تھیں۔ لیکن وہ جب آن لائن ہوتی تو وہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔

ایک دفعہ اس نے لکھا۔ ”میں آپ کو اپنی شاعری کی کتاب بھیجنا چاہتا ہوں جو کچھ دن پہلے چھپی ہے۔“

زارا الجھ گئی۔ ان دنوں لی حیدر اپنے آفس کے ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور اس سے رابطہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ کتاب پڑھنے میں کیا حرج تھا بھلا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اب اس کے اس کے رابطہ کرنے پر نہ تو زارا کو غصہ آیا نہ دکھ ہوا ورنہ وہ تو سوچتی تھی کہ اگر وہ کبھی اس سے رابطہ کرے گا تو وہ تو شاید اس کا حشر نشر کر دے گی مگر وقت انسان کو بہت بدل دیتا ہے۔ اب اس کے دل میں کوئی احساس نہ تھا اس کے لئے۔۔۔۔۔ نہ دکھ۔۔۔ نہ غصہ۔

زارا نے اسے اپنا ایڈریس دے دیا کچھ ہی دنوں میں اسے کوریئر سروس کے ذریعے حسین کی کتاب مل گئی۔ پہلے بیچ پر اس نے لکھا تھا۔

نامور ادیبہ، زارا علی کے لئے

”بیحد خلوص ہے“

حسین سید

بیچے اس نے اپنا سیل نمبر بھی لکھا تھا۔ وہی نمبر جس سے کبھی اس نے زارا کو بلاک کر دیا تھا۔ اب شاید ان بلاک کر دیا ہو۔

زارا کو ناظم ملتا تو تھوڑا تھوڑا کر کے حسین کی شاعری پڑھتی۔ زیادہ تر وہی پرانے دور کی شاعری تھی جو اس کی پڑھی ہوئی تھی کچھ نئی تھی۔ کتاب پوری کرنے کے بعد اس نے واٹس ایپ پر اسے میسج کر کے مبارکباد دی۔ ”میں نے آپ کی کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ بہت ہی اچھا لکھا ہے۔“

”تھینکس!“ زارا نے لکھا۔

اب وہ فیس بک پر بہت کم آن لائن ہوتی تو واٹس ایپ پر وہ ہیلو ہائے کرتا مگر وہ جواب نہیں دیتی۔ اس کا نمبر تو پہلے بھی تھا حسین کے پاس مگر زارا سے رابطہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔۔۔۔۔ کس منہ سے کرتا مگر زارا نے اس کی فیس بک پر ریکویسٹ قبول کر کے ایڈ کیا تو اس کی ہمت ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆



وہ جیسے ہی فیضان کے آفس کے دروازے پر پہنچی تو ناہید کو وہاں بیٹھے دیکھ کر لوٹ گئی۔ فیضان نے اسے دیکھ لیا تھا وہ کام ختم کر کے گھر چلی آئی۔ رات کو فیضان نے اسے کال کی تھی۔

”تم دروازے سے ہی کیوں لوٹ کر چلی گئیں تھیں؟“

”میں لوگوں کی سوئیٹ کمپنی کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسا بھی سوچ سکتی ہو۔“

”یہ سوچ اسی نے پھیلائی ہے آفس میں۔ پہلے تو میں نے صرف یہ سنا تھا مگر اب تو آنکھوں سے بھی دیکھ رہی ہوں۔“

”کیا دیکھا ہے تم نے۔“

”میں نے دیکھا یا نہیں مگر وہ جو کچھ تمہارے متعلق دوسروں کو بتا رہی ہے وہ بھی پوچھو اس سے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم ایسی لڑکی کو اتنی لفٹ کراتے ہو؟“

”مجھے نہیں معلوم وہ کیا کہہ رہی ہو مگر ضروری نہیں کہ تم جو دیکھو اور سمجھو وہ ایسے ہی ہو؟“

”آج کل وہ کیوں بیٹھتی ہے زیادہ تمہارے پاس؟“

”میں تو تمہیں دوسروں سے مختلف سمجھتا تھا مگر تم بھی عام لوگوں کی نظروں سے دیکھنے اور ان کی طرح سوچنے لگی ہو؟ وہ اس لئے بیٹھ رہی ہے آج کل کے اس کی شادی طے ہو چکی ہے۔ مگر کچھ مسائل ہیں اور وہ کچھ عرصے کے لئے چھٹی لینا چاہتی ہے۔ اپنے مسائل بتانے کے لئے وہ آئی تھی۔ پھر اگر اس نے آکر میری طبیعت پوچھتی تو شکریہ ادا کرنا میرا فرض تھا۔ وہ جیسی بھی ہے مگر میرے لئے قابل احترام ہے۔ تم اپنے رویے اور باتوں سے مجھے تکلیف پہنچاتی ہو۔ کیوں کرتی ہو ایسا؟“

”مجھے لگا کہ اب تم مجھے انور کرنے لگے ہو۔“

”ایسا نہیں ہے میں کچھ دنوں کے لئے کراچی جا رہا ہوں۔“

”اب میگزین کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے اس لئے اب میں بھی نہیں آؤں گی آفس۔“

”میگزین کا کام ختم ہوا ہے مگر کوئی نیا کام شروع کرنا ہے ابھی۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب کہ اب تک تو ہم نے صرف theoretical کام کیا ہے۔ عملی کام تو اب شروع کرنا ہے۔“

”کون سا کام؟“

”صرف میرے لکھنے اور تمہاری تصویریں بنانے سے تو مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اب ہمیں ”مشعل“ کے سوشل ورک کے ونگ سے بھی عملی طرح ہمیں دیکھی انسانیت کی خدمت کرنی ہے۔ میرا ساتھ دو گی ناں تم؟“

”گڈ! تو پھر کراچی سے واپس آ کر تم سے اس سلسلے میں رابطہ کروں گا۔“

”اوکے! اللہ حافظ Take care“

☆.....☆.....☆

”آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں“ ایک رات حسین نے میسج کر کے اس سے کہا۔

”آپ بتائیں اپنے بارے میں۔ کتنی کامیابیاں حاصل کیں؟“

”کراچی آنے کے بعد مجھے اسکا لرشپ مل گئی واپس آ کر مجھے گورنمنٹ جاب مل گئی۔“

”شادی تو کر لی ہوگی۔“ زارا نے پوچھا۔

”ایک نہیں دو شادیاں۔۔۔ میں خود آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ حقیقت تو آپ کو کہیں نہ کہیں سے پتہ چل

نی جائے گی تو خود ہی کیوں نہ بتادوں۔“

یہ سن کر زارا چونک پڑی پھر پوچھا۔

”اپنی امی کی پسند سے ان کی بھتیجی سے کی ہوگی۔“

”نہیں۔“ یہ سن کر وہ بری طرح چونک پڑی۔ اگر اس سے بھی نہیں کی تو پھر زارا کو یوں بغیر کوئی وجہ بتائے

چلے جانا۔۔۔ کوئی رابطہ نہ رکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟“

”تمہاری شادی ہوگئی؟“ اس نے پوچھا

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”کم از کم آپ تو دوسرے لوگوں کی طرح ”کیوں“ نہ کہیں۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم جس کیونٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں اگر لڑکیوں کے رشتے نہیں ہو پاتے تو وہ عمر بھر کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔ میرے اور آپ کے خاندان میں ایسی مثالیں موجود ہیں۔ پچھلی نسل کی خواتین گھروں میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو گئیں اور ہماری نسل میں بھی مجھ سمیت میری اور آپ کی کزنز اسی رسم کی سولی پر لٹکی ہوئی ہیں۔“

”مائے گاڈ۔۔۔ امیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔۔۔ یقین کرو ذرا میں نے بے وفا کی نہیں کی۔۔۔ میں اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ مجھے لگتا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔۔۔“

”ایسی کیا مجبوری تھی جب امی کی مرضی سے بھی شادی نہیں کی؟“

”نہی تو میں بتانا چاہتا تھا۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے موقع دو کچھ کہنے کا۔۔۔ اپنی بات کلیئر کرنے کا۔“

”کب کریں گے بات؟“

”ویک اینڈ کورات 9 بجے کے بعد میرے پاس ٹائم ہوتا ہے۔ کیا آپ کو سوٹ کرے گا۔“

”اوکے۔۔۔ ٹھیک ہے۔“

☆.....☆.....☆

”پہلی برتھ ڈے ٹویو۔۔۔“ فیضان نے کال کر کے کہا تو راتیل حیران رہ گئی۔ اس کی برتھ ڈے تو کسی کو بھی یاد نہیں تھی اور خود تو کب کا یاد رکھنا چھوڑ چکی تھی مگر فیضان نے آج اسے دس کیا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا۔

”تھینکس!۔۔۔ مگر کیا بغیر گفٹ کے۔“

”جو کہو۔ اپنی پسند بتاؤ گی یا میری پسند پر بھروسہ کرو گی۔“

”میں جو مانگوں وہ دو گے؟“

”بس میں ہوا تو ضرور دوں گا۔“

”بس میں تو ہے۔“

”کیا؟“

”مجھ سے آج گفٹ میں صرف یہ وعدہ کرو کہ تم کبھی بھی زندگی میں مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گے۔“

”اکیلا نہ چھوڑنے کے دو مطلب ہیں تمہارا اشارہ کس طرف ہے۔“

”تم میرے دکھ سکھ میں ساتھ رہو اور میں تمہارے۔“

”وہ تو ہم دے رہے ہیں۔۔۔“

”اور اگر زندگی میں ایسا وقت آئے کہ مجھے لگے کہ۔۔۔ میں۔۔۔ چاہوں کہ تمہارے نام سے جانی

جاؤں۔۔۔ تو۔۔۔“

وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔

”شادی؟“ فیضان نے پوچھا۔

”ہاں“

”میں یہ کر نہیں پاؤں گا۔“ وہ لمبی سانس لے کر بولا۔

”ہاں ظاہر ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ایک میچور اور طلاق یافتہ عورت سے نہیں کر سکتے شادی تمہارے

لئے خوبصورت کنواری لڑکیوں کی کوئی کمی ہے کیا؟“

”غلط ہے تمہاری سوچ۔ تم سے زیادہ عزیز مجھے کوئی نہیں۔“

”میں نے تو کہا تھا کہ اگر۔۔۔۔۔ ویسے فکر مت کرو میں زبردستی گلے پڑنے والوں میں نہیں ہوں اور

۔۔۔ کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہ تم شادی شدہ ہو تمہاری فیملی امریکہ میں ہے۔“

یہ سن کر فیضان بے تحاشا ہنسنے لگا تو وہ چڑی گئی۔

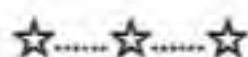
”میری بھی عزت نفس ہے۔ میری بھی انا اور خودداری ہے۔ میں پھر کبھی ایسی بات زبان پر نہیں لاؤں

گی۔“

”رائیل! محبت میں انا اور خودداری نہیں ہوتی۔ دل وروح کے رشتوں میں عزت نفس سے اوپر ہو کر سوچنا

پڑتا ہے۔ باقی یہ میرا وعدہ ہے کہ جب تک زندہ ہوں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا اور تم بھی میرا ساتھ دو ناں؟“

”ہاں“





”زارا! میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں جلد اپنے فیصلے سے آگاہ کروں گا مگر ان دنوں امی کا مجھ پر شدید دباؤ تھا۔ ہم انہی دنوں میرے والد کے ٹرانسفر کی وجہ سے شفٹ ہو گئے۔ وہاں بھی امی نے وہی رٹ لگائے رکھی۔ یقین کرو زارا میں گھر آتا ہی تھا تو وہ وہی رٹ لگائے رکھتیں یہاں تک کہ میں بے بسی سے جب دیوار سے اپنا سر ٹکراتا تو بہنیں آکر انہیں وہاں سے لے جاتیں ہاں میں بزدل تھا یا کمزور۔۔۔ میں گھر اور گھر والوں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا پھر میرے پاس نوکری بھی نہیں تھی۔ مجھے اسکا ر شپ ملی تو میں اس سچویشن سے بھاگنے کے لئے باہر چلا گیا۔ واپس آیا اور ایک اچھی جگہ گورنمنٹ جاب میں انجینئر بھرتی ہو گیا۔ امی کی اب بھی وہی رٹ تھی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر میں زارا سے شادی نہیں کر سکتا تو ان کی بھتیجی سے بھی نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ بلکہ اپنی کیونٹی میں تو کروں گا ہی نہیں۔۔۔۔۔ ہیلو!۔۔۔۔۔ سن رہی ہو زارا؟“

”ہوں۔۔۔۔۔ ہاں!“ زارا نے کہا جو مٹی کی اس رات اپنے پورشن کے چھوٹے سے صحن نما ٹیرس میں کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ مٹی میں دن بھر لو چلتی مگر رات کو وہی ہوا ٹھنڈی ہو جاتی۔ یہ شہر صدیوں سے ٹھنڈی راتوں اور ”ہوادانوں کا شہر“ کہلاتا۔ ہلکی ہوا کے جھونکوں میں وہ بوگن ویلیا کی گھنی بیل کے اوپر پورے چاند کو بھی دیکھ رہی تھی جو نیچے کے پورشن میں موجود چھوٹے سے لان میں تھی اور اس کے ٹیرس سے بھی اس کی شاخیں اور دوسرے درختوں کی شاخیں نظر آتیں۔

”پھر۔۔۔۔۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے ایک نرس سے شادی کر لی۔“

”بغیر سوچے سمجھے۔“ زارا نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔! مجھے فیلڈ ورک ملا تو مجھے سندھ کے ایک قصبے کے قریب جانا پڑتا تھا۔ ایک رات میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور مجھے قریبی سرکاری ہسپتال میں بے ہوشی کی حالت میں ایڈمٹ کر دیا گیا۔ میں زخمی ہو گیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نرس کو میری تنہا داری کی ڈیوٹی دیتے پایا۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ اسی سے شادی کر بیٹھا۔“

”محبت ہو گئی تھی اس سے؟“ زارا نے پوچھا

”نہیں۔۔۔۔۔ بس یوں سمجھو کہ وہ میری زندگی کی ایک بہت بڑی غلطی تھی۔“

”ایک بڑی غلطی تو تم میرے حوالے سے بھی کر چکے تھے۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا؟“

”میں تمہیں ایک کہانی دے رہا ہوں۔ اس پر ایک ناول لکھتا۔!“

”کہانی تو تم بہت پہلے ہی دے چکے ہو اب اسے مکمل کرو۔ پھر کیا ہوا؟“

”میرے والد بھی بہت سخت گیر اور اپنی روایات کے پاسدار تھے۔ وہ میری اس شادی پر اس قدر ناراض

ہوئے کہ مجھے گھر سے نکال کر جائیداد سے عاق کر دیا۔ جس کی وجہ سے میں نے بہت مشکل وقت دیکھا۔“

”ایک نرس کے لئے یہ سب برداشت کر لیا۔ میرے لئے نہیں۔“ زارا کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

”یہی احساس تو مارے ڈالتا ہے۔ بہت سزا بھگت چکا ہوں اور اب بھی بھگت رہا ہوں۔“

”کہانی مکمل کرو۔“

”اس عورت نے میری زندگی اجیرن کر دی۔ ظاہر ہے کہ اس کے اور میرے بیچ میں ڈھنی، سماجی اور جذباتی

فاصلے تھے۔۔۔ میں یہ رشتہ نبھاتا رہا کیونکہ وہ میرے دو بیٹوں کی ماں بن گئی تھی۔ اب وہ میرے لئے کچھ بھی

نہیں۔۔۔ نہ میں اس کے لئے کچھ ہوں۔ بس بچوں کی وجہ سے جڑے ہوئے ہیں۔ پتہ نہیں کتنی مرتبہ دل میں

اسے طلاق دینے کا خیال آیا مگر میں نہ دے سکا۔ اب وہ میرے گھر کے الگ پورشن میں رہتی ہے میں اپنے الگ

پورشن میں۔ اس کی اپنی زندگی ہے میری اپنی۔“

”اپنی۔۔۔ مطلب دوسری بیوی کے ساتھ؟“

”نہیں!“

”کیوں؟“

”پھر میری پوسٹنگ فیلڈ ورک میں ایک ایسے قصبے میں ہوئی جہاں سے ہر ویک اینڈ کراچی جاتے ہوئے

راستے میں تمہارا شہر آتا ہے۔ میرا یہاں آنا جانا رہا ہے وہیں پھر میری ملاقات ناچہ سے ہوئی۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں

اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔۔۔ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ پیسے والے لوگ ہیں میں نے اس کے لئے

اپنی دن رات کی محنت سے ایک گھر خریدا۔“

”کیوں؟ وہ تمہارے کراچی والے گھر کیوں نہیں رہی؟“

”یہی تو دوسری ٹریجڈی ہوئی۔۔۔ یا میری سزا ہے۔ جب میں نے اس سے شادی کی تو مجھے واقعی لگا کہ

اب میں جی رہا تھا۔ ورنہ گھر والوں کے قطع تعلق اور اس عورت نے تو میری زندگی جہنم بنا دی تھی۔۔۔ میں بیان نہیں کر سکتا اس دور اور میری مایوسی کی اس فیلنگ کو۔۔۔ ناجیہ سے شادی کر کے میں بہت خوش تھا۔ اسے کراچی لے کر گیا مگر وہ وہاں نہ رہ سکی۔“

”کیوں؟ کیا سبب تھا؟“

”بس وہی عام عورتوں والے رویے کہ تمہاری پہلی بیوی ہر وقت میری جاسوسی کرتی رہتی ہے۔ تمہارے بیٹے میری عزت نہیں کرتے حالانکہ وہ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماڈرن تھی۔ پھر والدین کی لاڈلی بھی۔“

”ہوں!“

”میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے والدین سے دور نہیں رہ سکتی۔ پھر میں نے اسے والدین کے گھر کے قریب ایک گھر لے کر دیا۔ اب وہ یہیں تمہارے شہر میں ہے۔ ہر ویک اینڈ کو اس کے پاس جا کر رہتا ہوں۔ اور پھر کراچی چلا آتا ہوں۔“

”بچے؟“ زارا نے پوچھا

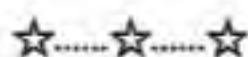
”ایک بیٹی ہے۔“

”اور کچھ؟“

”ہاں! میں یہ بھی بتا دوں کہ دوسری شادی کے بعد میرے والدین کی ناراضگی ختم ہو گئی تھی۔ جب میں نے ناجیہ کو ان سے ملایا تو میرے والد خوش ہوئے کہ وہ غیر ذات سے ضرور تھی۔ مگر بہت اچھا خاندان تھا بہت معزز۔۔۔ میری امی البتہ ہمیشہ شاکہ رہیں جب ناجیہ کراچی چھوڑ کر حیدر آباد آ گئی تب میری امی نے مجھ سے کہا تھا۔

”تیرے نصیب میں کوئی ’سیدزادی‘ نہیں۔ تو نے ایک سیدزادی کو ٹھکرایا تھا اسی کی سزا بھگت رہا ہے تیرا گھر کبھی آباد نہ ہوگا تو نے میری بھتیجی کو ٹھکرایا تھا نا۔۔۔“ میں نے ماں سے کہا

”ماں! تم نے زارا کو ٹھکرایا تھا نا۔۔۔ اس کی سزا ہے یہ میرے لئے بھی اور آپ لوگوں کے لئے بھی۔۔۔ کیونکہ وہ ’سیدزادی‘ تھی۔“



بہت دن گزر گئے فیضان نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تو وہ پریشان ہو گئی۔ وہ اسے آفس میں کال کرتی تو پتہ چلتا کہ وہ اپنی سیٹ پر نہیں ہے اگر وہ خود سیل فون پر انینڈ کرتا تو مصروفیت کا ہتا کر بعد میں کال کرنے کا کہتا مگر وہ کال کرتا نہیں تھا۔ ایک دن اس نے اس سے اس رویے کی شکایت کی تو وہ کہنے لگا۔

”کیا ہو گیا ہے رائیل؟ کیا یہ بھی کوئی ناراض ہونے والی بات ہے؟“

”نہیں۔۔۔“ اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

وقت تیزی کے ساتھ گزرتا رہا۔ اس کی طرف سے بہت کم رابطہ ہوتا۔ تب ایک شام رائیل کے قلم سے الفاظ احساس کا روپ دھارنے لگے۔ اس نے ایک قلم لکھ ڈالی۔۔۔ پہلی مرتبہ۔۔۔

میرے سائیں!

میں نے

اپنے تمام

ششے جیسے نازک

جذبے

تقلیوں جیسے خواب

گلاب کی پگھڑیوں جیسی

امیدیں

جو عرصے سے

چن چن کر

اپنے من میں

سنبھال کر رکھیں تھیں

وہ سب

تمہاری راہوں میں



بچھا دیں ہیں  
وقت کی دھول  
ان کو اب تک  
میلان نہیں کر پائی ہے  
مگر۔۔۔

جب تم  
ان سب کو اپنے پیروں تلے  
روندتے ہوئے  
گزر جاتے ہو  
تب

میں۔۔۔  
سکتی۔۔۔ بکھرتی ہوئی  
مسلی ہوئی گلاب کی پگھڑیوں کی سی  
امیدوں

چور چور ہوئے شے جیسے  
جذبوں  
اور تلیوں جیسے  
خوابوں

اور  
من کے پاتال میں بسی  
میری ان چھوٹی محبت کو

سمیٹ رہی ہوں

تب تم۔۔۔

ہر قدم پر

حیراں ہو کر

فقط یہ ہی کہتے ہو۔

کیا ہوا؟

کیا ڈھونڈ رہی ہو؟

کیا کھو بیٹھی ہو؟“

اس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار نکل آئے کہ جدائی کا لمحہ جیسے سر پر کھڑا تھا۔۔



دردِ دل  
کسیر

پھر اس نے یہ نظم واٹس ایپ کے ذریعے فیضان کو بھیجی تو اسی رات اس نے فون کیا تھا۔

”کیوں پریشان ہو رانیل؟ آج کل میں بہت مصروف ہوں مجھے بہت سے کام کرنے ہیں اور وقت بہت کم ہے۔“

وہ چونک پڑی اور پوچھا ”وقت کیوں کم ہے؟ کہیں جارہے ہو؟“

”ہاں تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا کل گاؤں جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کی مصروفیت کے سبب تم سے رابطہ نہ کر پاؤں۔“

”جانے سے پہلے مجھ سے بات کرنا۔ بہت ساری باتیں کرنی ہیں تم سے۔“

”ہاں۔۔۔ ضرور! اپنا خیال رکھنا۔“

”خیال تم رکھو اپنا۔ اپنے کام کی مصروفیات میں اپنے آپ کو ہی بھلا رکھا ہے۔“

”اوکے میڈم!“ وہ شوخی سے بولا۔

”کیا؟! تم واپس جارہے ہو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

رانیل صدمے سے بولی

”اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ واپس تو جانا ہی تھا۔“

”مگر۔۔۔ اس سے پہلے تم نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا۔۔۔ مجھے یہاں کس کے سہارے چھوڑ جاؤ گے؟“

”تمہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے رانیل! تمہیں اپنی زندگی خود چینی ہوگی اور اس کے لئے بہادر بنو۔ چھوڑ دو سہارے ڈھونڈنا۔“

”واپس کب آؤ گے؟ کتنے عرصے کے لئے جارہے ہو؟“ رانیل نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔

”ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

”ہاں! تم نے بتایا تھا کہ تم زیادہ عرصہ ایک جگہ رہ نہیں سکتے۔ لیکن کب تک یوں چلے گا فیضان؟“

”ہماری زندگی بذات خود ایک سفر ہے۔ اس سفر کے دوران ہم کتنے ہی اسٹیشن کر اس کرتے ہیں۔ اس سفر میں ہم دوسرے مسافروں سے بھی ملتے ہیں۔ کچھ کے ساتھ مختصر سا تھ رہتا ہے اور کسی کے ساتھ لمبا۔ اسی طرح تم اور میں بھی ملے اور زندگی کا کچھ سفر ساتھ طے کیا۔ لیکن فی الحال ہمارے راستے الگ ہو رہے ہیں۔“

”اور۔۔۔ تمہارے خواب؟ معیاری ادبی رسالہ؟ اور ادبی ثقافتی سرگرمیاں؟ وہ ٹرسٹ کا قیام؟“

”ہاں! یہ سارے میرے خواب ہیں۔ میں نے ایک چراغ روشن کر دیا ہے اب اسی سے کئی لوگ دوسرے دیئے روشن کریں گے۔ میری جگہ کوئی اور ہوگا آفس میں۔ پھر تم بھی تو ہو۔“

”مگر۔۔۔ ٹرسٹ۔۔۔؟“

”اتنے دن میں اسی سلسلے کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ ایسے سمجھو کے اس کے قیام کے انتظامات تقریباً مکمل ہو چکے ہیں اور یہ بھی سن لو کہ اس کی چیئر پرسن تم ہوگی۔“

”میں۔۔۔۔۔؟؟؟“ رائیل چونک پڑی۔

☆.....☆.....☆

”اب میں معاشی طور پر بہت مضبوط پوزیشن میں ہوں۔ میں نے کراچی میں اپنا گھر بنا لیا ہے، اس شہر میں بھی گھر ہے۔۔۔ گھریلو طور پر میں ایک ناکام شخص ہوں مگر معاشی طور پر مستحکم ہوں۔“ حسین بولا۔

”آپ نے مجھ سے اتنے عرصے کے بعد رابطہ کیوں کیا۔۔۔؟ آپ نے جب میرے ہی شہر سے شادی کی تھی میں تب یہیں تھی۔۔۔ تب تو میرا خیال نہیں آیا تھا؟“

”میں پچھلے ایک سال سے فیلڈ ورک میں لوٹتے ہوئے ہر ویک اینڈ پر ایک دن یہاں گزارتا ہوں اور سنڈے کراچی میں۔۔۔۔۔ بس بٹ کر رہ گیا ہوں۔۔۔ میرے دل پر بوجھ تھا عرصے سے۔۔۔ وہ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔۔۔ بتانا چاہتا تھا کہ میں بے وفا نہیں تھا۔۔۔ میں بس الجھ گیا تھا۔۔۔ پھر بھٹک گیا۔۔۔ تم سے رابطہ اس لئے کیا کہ اچانک تمہارے اکاؤنٹ اور ڈی پی پی پر نظر پڑی تو خود کو روک نہ سکا۔ اب میں ہفتے کے پانچ دن شام کو تنہائی میں گزارتا ہوں، چھٹا دن اس بیوی کے ساتھ جس نے میرا مان توڑ دیا اور مجھے بانٹ دیا دو شہروں میں اور اتوار یعنی ساتواں اپنے بیٹوں کے ہمراہ گزارتا ہوں۔“



”آپ نے بہت دولت کمائی ہے اب۔ ہفتے کے پانچ دن تنہائی میں کیوں گزارتے ہیں؟ مل جائیں گی کمپنیاں بہت۔“ زارا نے طنز سے کہا۔

”آپ کی بات درست ہے۔ میری پوسٹنگ اکثر فیلڈ ورک میں ایسی ایسی جگہوں کی آفر ہوئی اور کوشش بھی کی گئی مگر میں وقتی تعلقات کا قائل نہیں میں پڑاؤ ڈالنے والا شخص ہوں۔۔۔“

”آپ نے اپنا دل ہلکا کر لیا۔ اپنی بات کر لی بہت شکریہ!“

”کیا میں تم سے کبھی کبھار بات کر سکتا ہوں؟“

”کس حیثیت سے اور کیوں؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔“

”آپ نے ساری عمر نہ خود کو جانا نہ مجھے۔“

یہ کہہ کر زارا نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ جب سے حسین نے دوبارہ سے اس سے رابطہ کیا تھا اسے لگا کہ اس نے اس پرانے زخم کو پھر سے تازہ کر دیا تھا۔ حسین ا یکدم سے اس کا ماضی واپس لے آیا تھا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ علی حیدر کا اتنا پتہ نہیں تھا ورنہ وہ اس کو بتاتی اور مشورہ دیتی۔“

☆.....☆.....☆

فیضان کا سیل فون مسلسل بند تھا۔ وہ کئی مرتبہ ٹرائی کر چکی تھی۔ آخر اس نے اس کے گھر کے لینڈ لائن فون پر کال کی دوسری طرف فیضان کے ملازم نے کال اٹینڈ کی۔

”فیضان صاحب کہاں ہیں؟“ رائیل نے پوچھا۔

”وہ تو آج گاؤں روانہ ہو گئے ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“

کہتے ہوئے رائیل نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ نہ جانے کیوں اسے لگا کہ وہ اس سے بہت دور چلا گیا تھا حالانکہ فیضان نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ گاؤں جائے گا۔ مگر وہ اب روز اس سے بات کرتی تھی۔ وہ تو جیسے اب اس کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا اس لئے وہ اس دوری کو برداشت نہ کر پا رہی تھی وہ ایک دوسرے کے قریب ہو کر

بھی جیسے دور تھے۔ ان کے درمیان ایک ان دیکھی سی دیوار حائل تھی۔ ایسی دیوار جو اسے اس کے پاس آنے نہیں دیتی تھی اور وہ تو اس کے پار جا ہی نہیں پار ہی تھی۔

ایک شام جب وہ بہت اداس تھی تو اپنی ڈائری لے کر لکھنے کی کوشش کی تو الفاظ ایک روانی سے موتیوں کی طرح ڈائری کے صفحوں پر بکھر گئے۔

میرے سائیں!

تم جو سدا کہتے ہو

”میں صرف اور صرف تمہارا ہوں“

پر میرا دل کیوں نہیں مانتا؟

کیوں ایسا لگتا ہے کہ

تم تو

دیوار پر پھیلی

خوبصورت پھولوں بھری

ایک تیل کی طرح ہو

جس کی جڑیں

میرے آنگن میں نہیں

مگر دیوار کی پرلی طرف ہیں

ہاں۔۔۔

یہ ضرور ہے کہ

اس کی شاخیں

میرے آنگن میں بھی پھیل چکیں ہیں

اور ان کے پھولوں کی خوشبو نے پیار بن کر

میرے جیون انگنا کو بھی

مہکا دیا ہے

مگر۔۔۔

اس کی جڑیں میرے جیون کے آگن میں نہیں

کیا۔۔۔

ہم کسی ایسی روشنی کو

اپنا سمجھ سکتے ہیں

جو

گھر سے باہر لگے کھجے سے

ہمارے صحن کو بھی روشن کرے؟

یا

ساتھ والے گھر میں لگے

قلموں سے

ہمارے گھر کو بھی روشنی دیتے ہوں؟

کیوں میرا دل نہیں مانتا

کہ

تم صرف میرے ہو؟

ہاں۔۔۔

شاید اس لئے کہ

جانتی ہوں کہ

تم ہی میرا پیار ہو

میرا اعتبار ہو

تم ہی میری طاقت ہو

تم ہی میری صداقت ہو

تم میرے سنے ہو

تم میرے اپنے ہو

تم ---

میرے سب کچھ ہو

مگر

تم میرا نصیب نہیں ہو!

ایک ہفتے سے زائد عرصہ ہو گیا کہ فیضان گاؤں میں ہی رہا۔ راتیل کی اس سے بہت کم بات ہو پاتی تھی۔ وہ اس سے رابطہ نہ کرنے کی شکایت کرتی تو وہ مصروفیت کا بتا دیتا آخر ایسی بھی کیا مصروفیت تھی کہ وہ اس سے تفصیلی بات نہیں کر سکتا تھا۔ چلو سارا دن تو وہ زمینوں اور حویلی کے معاملات میں مصروف رہتا ہوگا مگر رات کو تو بات کرے اس کا دل چاہتا کہ وہ ہر رات دیر تک ڈھیروں باتیں کریں۔۔۔۔۔ مگر اس کے چاہنے سے زندگی میں بھلا اسے کیا ملا تھا۔ آخر ایک دفعہ وہ اس پر برس پڑی۔

”کیا ہوں میں تمہارے لئے؟ گاڑی کا ایک قالو پیہ جو صرف ضرورت کے وقت ہی یاد آتا ہے؟“

”اف۔۔۔۔۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

☆.....☆.....☆

”زارا! ہر ہفتے جب بھی تمہارے گھر کے بہت قریب سے گزر کر گزر جاتا ہوں تو ایک عجیب سا احساس ہوتا

ہے۔۔۔۔۔ تمہارے پاس ہونے کا۔۔۔۔۔ جو بہت اچھا لگتا ہے۔“

زارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد حسین نے کال کی اور کہا۔

”تم نے میرے میسج کا جواب نہیں دیا؟“



”کیا جواب دوں آپ کو؟ کہاں ہیں آپ اس وقت؟“

”اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے۔“

”تو پھر گھر جائیں ناں۔۔۔!“

”تمہاری یہ ناں سننے کے لئے تو کھڑا ہوں۔ تمہاری سریلی سی آواز اور ہر بات میں ناں، کہنا مجھے تب بھی

بھلا لگتا تھا اور اب بھی۔“

”پلیز۔۔۔!“

”او کے!“

زارا الجھ گئی کہ حسین آخر اس سے کیا چاہتا تھا۔ پہلے تو صرف اپنے جانے کا سبب واضح کرنا چاہتا تھا اور اب اس طرح سے بات کرنا کہ جیسے وہ کئی سال پہلے کی طرح بات کر رہے ہوں۔

☆.....☆.....☆

جب سے رائیل نے فیضان سے اس کے امریکہ جانے کے بارے میں سنا تھا وہ تو جیسے سن ہو کر رہ گئی تھی۔ ابھی تو اس نے جینے کا حوصلہ پایا تھا کہ وہ جانے کی بات کر رہا تھا۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ نہ جانے کیسے اس کے من میں فیضان کے ساتھ کی خواہش جاگ اٹھی تھی اور آنکھوں نے کئی سنے بن لئے تھے۔۔۔ ایسی خواہش اور سنے جو ہر عورت کے لئے بہت بڑے معنی رکھتے تھے اور رائیل نے تو اب جا کر اس احساس کو محسوس کیا تھا جو لڑکیاں کم عمری میں ہی محسوس کرتی ہیں مگر اس کی زندگی میں کوئی آیا بھی تو اب۔۔۔ اور۔۔۔ وہ بھی جانے کی بات کر رہا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس کا جیون ساتھی نہیں بن سکتا تو کوئی بات نہیں مگر اس کے قریب تو رہے۔

انہی دنوں میں فیضان نے اسے ایک اور سر پرانز دیا۔ وہ اچانک ہی اس کے گھر آیا تھا اس سے ملنے۔ بابا بیرونے اسے بتایا کہ وہ اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا کر آیا تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اور وہ بے اختیار اٹھ کر ڈرائنگ روم میں پہنچی۔۔۔۔ اسے دیکھ کر رائیل کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ اسی کے گھر میں اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا۔ فیضان اسے دیکھ کر احترام سے کھڑا ہو گیا اور اپنے ساتھ لایا ایک اس کی

طرف بڑھایا۔

”یہ۔۔۔ کس خوشی میں؟“ وہ چونک کر بولی

”آج میری Birthday ہے تم سے تو امید نہیں ہے کہ تم celebrate کرو گی۔ اس لئے خود ہی ایک لے کر آ گیا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”پپی برتھ ڈے۔۔۔!“ رائیل بولی۔

بابا بھرو چائے کے ساتھ کچھ لوازمات لے آیا۔ رائیل نے فیضان سے ایک کانٹے کے لئے کہا اور پھر وہ دونوں چائے کی ہلکی ہلکی چسکیوں کے ساتھ کھانے لگے۔

”برتھ ڈے کا گفٹ اپنی پسند سے لو گے یا میری پسند کا؟“ رائیل نے دھیرے سے پوچھا۔

”گفٹ میں مجھے صرف ایک وعدہ چاہیے۔“

”کیسا وعدہ؟“ رائیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

”وعدہ کرو کہ میرے جانے کے بعد تم پھر پہلے کی طرح نہیں ہونگی بلکہ ایک بامقصد زندگی کی شروعات کرو گی۔“

”کیوں جا رہے ہو۔“

رائیل کی آنکھوں نے کناروں پر ضبط کیے ہوئے آنسو ستاروں کی طرح جھمکار ہے تھے

”مجبوری ہے۔“ فیضان نے دھیرے سے کہا۔

”کیسی مجبوری؟“

”وہاں پر کچھ چیزیں ادھوری چھوڑ کر آیا تھا۔“

”اب یہاں پر بھی ادھوری چھوڑ کر جاؤ گے۔“

”تم پریشان مت ہو سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت اب فاصلے کم ہو گئے ہیں، ہمارا نیٹ پر رابطہ رہے گا۔۔۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مصروفیت یا مجبوری کی وجہ سے کبھی رابطہ کٹ بھی جائے تو بدگمان مت ہونا۔ تمہیں

حوصلے سے جینا ہے۔۔۔ میرے لئے۔ دعا کرنا کہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ تمہیں زندگی کی کوئی بڑی خوشی دے

سکوں۔“

”بڑی خوشی کہاں میرے نصیب میں۔۔۔“

کتنے عرصے کے لئے جارہے ہو؟“

”فی الحال تو عارضی جدائی ہے۔ آگے کا پتہ نہیں۔ سب وقت اور حالات پر منحصر ہوگا۔“

”کب جارہے ہو؟“

”پرسوں فلائٹ ہے میری۔“

”اتنی جلدی۔۔؟ اور تم مجھے اب بتا رہے ہو۔“

اسے یہ سن کر شدید جھٹکا لگا تھا۔

”مجھے پتہ نہیں تھا کہ میری زندگی میں آنے والی بہار اس قدر مختصر ہوگی۔“ رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔

”ایسا مت کرو راتیل! تمہارے آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔۔۔ دیکھو کچھ چیزیں ہمارے ہاتھ میں

نہیں ہوتیں۔۔۔ البتہ جو مختصر وقت رہ گیا ہے ہم اسے یادگار بنا سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ وہ آنسو پونچھ کر بولی۔

”ہمارے پاس فقط کل کا دن ہے۔ کل شام میں نے اپنے ایک دوست کے خوبصورت فارم ہاؤس پر

”مشعل“ کے سوشل ونگ کی تقریب کا انعقاد کیا ہے جس کے بعد ڈنر بھی ہوگا۔ اس تقریب میں تمہیں ”مشعل“

کے قائم مقام چیئر پرسن کے طور پر متعارف کرایا جائے گا۔ آج تک میں نے تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر میرے

ساتھ وقت گزارنے پر مجبور نہیں کیا لیکن میری خواہش ہے کہ کل شام ہم کچھ یادگار لمحے ساتھ گزاریں۔ کل شام

میں تمہیں لینے آؤں گا۔ چلوگی نہ میرے ساتھ؟“

”ہاں۔۔۔ ضرور چلوں گی۔۔۔ اتفاق تو میرا بھی بنتا ہے اپنی زندگی پر۔۔۔ ایک شام۔۔۔ صرف ایک

شام تو ہم بھی اپنے نام کریں بغیر کسی ڈر اور خوف کے۔۔۔“

فیضان مسکرانے لگا۔

☆.....☆.....☆

”تم نے اپنا ہیئر اسٹائل بدل لیا ہے۔ فیس بک پر تمہاری تصویروں میں دیکھا ہے۔“ حسین نے کہا۔

”کیوں کیا بری لگتی ہوں اس اسٹائل میں؟“ زارا نے پوچھا

”نہیں تم اب بھی بہت خوبصورت ہو مگر تمہارا وہ مخصوص ہیئر اسٹائل اب بھی مجھے نہیں بھولتا۔ تمہارے بال بہت گھنے ہوتے تھے۔ جنہیں تم پیچھے سے اوپر اٹھا کر کلپ لگاتی تھیں۔ آوارہ لٹیس ہمیشہ کانوں کے برابر اور پیشانی پر آ جاتیں تھیں۔۔۔“

حسین بڑی محویت سے کہے جا رہا تھا۔ زارا حیران ہو کر سن رہی تھی۔۔۔۔۔ اسے ذرا احساس نہ تھا کہ وہ دو بیویوں کا شوہر تھا۔۔۔۔۔ ان کے تین بچوں کا باپ تھا اور زارا کو چھوڑ گیا تھا۔

”زارا میں بہت تھک گیا ہوں۔۔۔ سوچ رہا ہوں کہ چھٹی لے کر یورپ گھومنے جاؤں۔۔۔ تم چلو گی۔۔۔ میرے ساتھ؟“

”کس حیثیت سے چلوں گی حسین صاحب؟ یہ یورپ نہیں ہے کہ بیک اٹھاؤں گی اور چل پڑوں گی۔“

”تم کہیں اور تو انوالونڈ ہو؟ ہو سکتا ہے کہ میں کوئی ڈیشن لوں۔۔۔ مگر تم اس فیصلے کو قبول کرو گی؟“

”دو بیویوں اور تین بچوں کے بعد بھلا آپ کیا ڈیشن لیں گے؟“

”ہاں۔۔۔ تم ٹھیک کہتی ہو مگر میں انفرڈ کر سکتا ہوں۔۔۔ جو وقت گزر گیا اس میں تم نے بھی دکھ اٹھائے اور میں نے بھی۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ اب آنے والے وقت میں ہم دونوں ساتھ خوشیاں بانٹیں۔“

”نہ محبت اور نہ شادی۔۔۔ کوئی کھیل نہیں ہوتے۔ زندگی سنوار بھی دیتی ہے اور تباہ بھی کر دیتی ہے یہ محبت اور شادی۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو میں شاید شادی کے لئے بنا ہی نہیں تھا۔۔۔ میں بالکل ٹوٹ چکا ہوں۔۔۔ میرا بھروسہ ٹوٹ چکا ہے۔“

”دوسروں کو توڑنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ میری زندگی جو میں آج گزار رہی ہوں اس کے ذمہ دار آپ ہیں میرا اعتماد اٹھ گیا ہے شادی شدہ لوگوں سے۔ پلیز Leave me alone (مجھے اکیلا چھوڑ دیں)۔“

☆.....☆.....☆

کارشہر کی رونقوں کو پیچھے چھوڑ کر ہائی وے پر رواں دواں تھی۔ فیضان کارڈ رائیو کر رہا تھا اور رائیل اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی وہی رائیل جسے لوگوں کا ہمیشہ خوف رہا کہ کوئی اسکیٹڈل نہ کھڑا کیا جائے۔۔۔۔۔۔ مگر آج وہ بہت پر اعتماد اور بدلی ہوئی رائیل تھی جسے اب کسی کی بھی پروا نہ رہی تھی کہ وہ جان چکی تھی کہ زندگی اللہ تعالیٰ کا بیش بہا تحفہ ہے انسان کے لئے اس لئے اسے اپنی زندگی خود جیسی چاہئے۔ فیضان تو اسے ہمیشہ سے ہی ایسا دیکھنے کا خواہش مند تھا اور آج اسے بہت خوشی ہو رہی تھی رائیل کو پھر پہلے والی رائیل کے روپ میں دیکھ کر۔۔۔۔۔۔ اٹل اور پر اعتماد رائیل۔۔۔۔۔۔

آج دونوں ہی بہت شاندار اور پروقار لگ رہے تھے۔ فیضان نیوی بلیوسوٹ میں بہت ہینڈسم لگ رہا تھا اور رائیل بلیو اور ہرے رنگ کی کومینیشن والی ساڑھی پر برسوں بعد ہلکے میک اپ، میچنگ جیولری اور جوڑے والے ہینر اسٹائل میں بہت ہی اسٹائش لگ رہی تھی۔ اسے آس پاس پھیلے سبزے اور فصلوں کے درمیاں چوڑی ہائی وے پر فیضان کے برابر بیٹھے ہوئے یہ لمحے خواب کی مانند لگ رہے تھے۔

”رائیل! تم نے پہلے کبھی گلاب کا فصل دیکھا ہے؟“

اچانک فیضان نے سوال کیا تو وہ اپنے خیالوں سے نکل کر چونک کر بولی۔  
”نہیں۔“

”ہم جس دوست کے فارم ہاؤس کی طرف جا رہے ہیں اسی کا گلاب کا فصل ہے جہاں سے ہم کچھ ہی دیر میں گزریں گے۔ کیا خیال ہے؟ اتریں وہاں کچھ دیر کے لئے؟“

”ضرور! وہاں کا خوبصورت منظر یقیناً میرے اندر کے فنکار میں ایک نئی روح پھونکے گا۔ میں تو فطرت کی دیوانی تھی کبھی۔“

فیضان مسکرا پڑا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد فیضان نے کار کو سڑک کے کنارے پر روک دیا۔ جہاں سے حد نظر تک گلابوں کی فصل پھیلی ہوئی تھی۔

”ہمیں یہاں سے کار سے اتر کر تھوڑا نیچے پیدل چلنا پڑے گا۔“

”چلیں۔“



وہ بھی بڑی خوشدلی سے کہہ کر کار کا دروازہ کھول کر اتری اور دونوں سڑک سے نیچے جانے والے کچے رستے پر چلنے لگے تو سروں پر گٹھڑاٹھا کر گھر کی طرف جانے والی خواتین اور بچے انہیں حیرت سے دیکھنے لگے۔ اچانک رائیل کے کانوں میں گھنٹیاں بجنے کی آواز آئی تو اس نے چونک کر اس طرف دیکھا۔

کچھ فاصلے پر چرواہے گائے، بھینسوں اور بکریوں کے ریوڑ ہانکتے ہوئے جا رہے تھے۔ جن کی گردنوں سے بندھی چھوٹی بڑی گھنٹیاں خاموش ماحول میں خوبصورت ارتعاش نکھیر رہی تھیں۔ شام گہری ہوتے ہی پرندوں کی چچہاہٹ اور کوئل کی کوک نے ماحول کو سحر زدہ بنا لیا تھا۔ ہر طرف گلاب ہی گلاب تھے جو ہواؤں کو خوشبو سے معطر کر رہے تھے۔ ڈوبتا سورج سرخ گولے کی مانند نظر آ رہا تھا اور سرمئی ہوتی ہوئی شام میں آسمان پراڑتے ہوئے پرندوں کے غول عجب سماں پیش کر رہے تھے۔ رائیل کسی سحر زدہ کی طرح اس ماحول میں کھو کر رہ گئی تھی۔

”چلو ایک سیلفی ہو جائے۔“

فیضان نے اس کے برابر کھڑے ہوتے اپنے آئی فون سے ایک سیلفی لی۔  
 ”ایک میں بھی لوں گی۔“ رائیل نے بھی مسکرا کر ایک سیلفی بنائی۔ آس پاس گزرنے والے مقامی کسان اور عورتیں حیران ہو کر اس جوڑے کو دیکھتیں گزرتی رہیں۔

”رائیل! یہ منظر ضرور پینٹ کرنا۔“

”ہاں! میں نے اس لینڈ اسکیپ کی تصویریں لے لی ہیں ضرور بناؤں گی۔“  
 ”مگر۔۔۔۔۔ یہ بھی یاد رہے کہ فقط لکھنے اور تصویر کشی کرنے سے ہماری ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی ہمیں عملی جدوجہد بھی کرنی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ رائیل گم سم سی بولی تو وہ ہنس کر کہنے لگا۔

”میں بھی ناں۔۔۔۔۔ اتنے رومینک ماحول میں تمہیں لکچر دینے لگا۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ یہ گفٹ میں یہیں پیش کرنا چاہتا تھا۔۔۔ اس حسین ماحول میں بہت پہلے due تھا ناں۔“

اس نے ایک خوبصورت سا باکس اس کی طرف بڑھایا رائیل نے باکس اس سے لے کر کھولا جس کے اندر بے حد خوبصورت اور قیمتی گھڑی جگمگا رہی تھی۔

”اوہ۔۔۔ کس قدر خوبصورت واج ہے۔۔۔ تھینک یو۔“

یہ کہہ کر اس نے واج کو باکس سے نکالا تاکہ ابھی کلائی پر پین لے کہ اچانک وہ اس کے ہاتھ سے گر کر نیچے کھڑ میں پڑے بڑے سے پتھر پر جا گری۔ رائیل بے چین ہو کر واج کو اٹھانے کے لئے نیچے جانے لگی۔

”ٹھہرو! میں اٹھا کر لاتا ہوں۔“

فیضان اسے وہیں روک کر خود وہاں سے واج کو اٹھالایا۔

”گرنے کہ وجہ سے بند ہو گئی ہے شاید اسے نقصان پہنچا ہے۔“

”مگر۔۔۔“ رائیل بے چین ہو کر بولی۔

”جب میں نے اسے باکس سے نکالا تھا تو یہ چل رہی تھی اور ٹھیک ٹائم بتا رہی تھی۔“

”خیر ہے۔۔۔ میں تمہارے لئے کوئی اور گفٹ لوں گا۔“

”نہیں۔۔۔“ رائیل بے چینی سے اس کے ہاتھ سے گھڑی لے کر بولی۔

”مجھے یہی چاہیے تم نے میرے لئے بہت چاہت سے لی ہے ناں۔“

”مگر یہ تو رک گئی ہے۔ خراب ہو گئی ہے۔“ وہ حیران ہو کر بولا۔

”نہیں نہیں۔۔۔ بلکہ اس نے تو وقت کو محفوظ کر لیا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”وہ وقت۔۔۔ جب ہم اس حسین منظر۔۔۔ اور گلابوں کے بیج کھڑے تھے اور تم نے مجھے یہ گفٹ کی تھی۔“

اس نے اس وقت کو محفوظ کر کے روک دیا ہے۔ میں جب بھی اسے دیکھوں گی تو یہ وقت یاد آئے گا۔“

فیضان اسے حیرت سے تنک رہا تھا اور پھر کہا۔

”میں تو اب بھی تمہارے ساتھ ہوں۔“

”مگر کل کے بعد نہیں ہو گے۔“ اس کی آنکھوں میں عرصے سے ر کے آنسو بہہ نکلے تو فیضان نے بے چین ہو

کر اس کے ہاتھ تھام کر چوم لئے اور دھیرج سے کہا۔

”میرا اور تمہارا تو ازلی روحانی رشتہ تھا، ہے اور رہے گا۔ شاہ لطیف سائیں کے اس بیت کی طرح

”نکا کن فیکون جی، کلو لگ لحم بنو حو نہ بت میں انجاں کی آدم، موں تو ہیں سیں سنگ اھا سا نجاہ سپریں“  
(نہ کن فیکون کی صدا تھی، نہ ہی آدم کی تخلیق ہوئی تھی، میرا تم سے عشق اس وقت سے ہے)  
رائیل نے اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا۔

”چلو۔۔۔ رات ہونے کو آئی ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔“

فیضان نے اسے دھیرج سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف چل دیا۔

☆.....☆.....☆

”زارا! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم حسین کو اتنی لفٹ کراؤ گی۔۔۔ نہ وہ پہلے تمہارے قابل تھا نہ اب۔“  
علی حیدر کے واپس آتے ہی جب زارا نے اسے حسین سے بات چیت کے بارے میں بتایا تو وہ سخت غصے میں آ گیا تھا۔

”وہ اپنی ماضی کی غلطی پر شرمندہ تھا اور بتانا چاہتا تھا کہ اس نے بے وفائی نہیں کی۔“

”بڑی چالاکی سے تمہاری سادگی سے فائدہ حاصل کر رہا ہے ہمدردی حاصل کر کے۔ اس نے جو زیادتی تمہارے ساتھ کی ہے قدرت نے اسے اس کی سزا دی ہے۔ اسے کبھی سکون نہیں مل سکتا۔“  
”تو اب میں کیا کروں؟“

”بلاک کر دو اسے ہر جگہ سے۔ کوئی رابطہ نہ رکھو۔۔۔ پلیز زارا! اپنی قدر پہچانو۔“

”اوکے! ایسا ہی کروں گی۔ تمہاری شادی کب ہو رہی ہے؟“

”بہت جلد۔ میں باہر گیا تو پیچھے سے انہوں نے تاریخ بھی طے کر دی ہے اور تیاری بھی تقریباً مکمل کر لی۔“  
”بہت اچھی خبر ہے۔ مبارک ہو!“

☆.....☆.....☆

فیضان رائیل کے ہمراہ جب فارم ہاؤس پہنچا تو ”مشعل“ کے ممبران نے ان کا بہت ہی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ بہت ہی وسیع اور خوبصورت فارم ہاؤس تھا۔ پروگرام کا باقاعدہ آغاز کیا گیا۔ فیضان اور رائیل کو دوسرے ممبران کے ہمراہ اسٹیج پر بٹھایا گیا اور پھر جب تالیوں کی گونج میں اس کا نام چیئر پرسن کے طور پر پکارا

گیا۔ تو رائیل کو ایسے لگا کہ یہ سب ایک خواب سا تھا اس نے فیضان کی طرف دیکھا تو وہ اسے ہی دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ باقی پروگرام بھی بہت ہی رنگارنگ تھا۔ پروگرام کے بعد ڈنر تھا۔ ڈنر کرنے کے بعد لوگ ٹولیوں میں بٹ کر چائے اور کافی کو انجوائے کر رہے تھے ہر طرف رنگ برنگی روشنیاں تھیں اور ٹھنڈی ہوا روح کو سرشار کر رہی تھی۔ رائیل چائے کا گلاسے کر ایک حوض کے کنارے رکھی بیچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ حوض کے درمیان ایک فوارہ تھا جس سے بکھرتا نکلتا پانی جھللاتی روشنیوں کی وجہ سے جیسے رنگ بکھیر رہا تھا۔ وہ کتنی دیر وہاں بیٹھی رہی اسے پتہ ہی نہ چلا۔

”رائیل! کب سے اکیلی بیٹھی ہو۔ کیوں؟“

رائیل نے چونک کر اسے دیکھا وہ اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔

”ٹوی پونڈا تارائین چڈھن گاڑھا گل۔۔۔ مڈھن ملندا سیں“

(جب سرخ پھول ٹہنیوں پر کھل اٹھیں گے تب ملیں گے ہم تم)

اچانک اسٹیج پر گاتے نوجوان کے گیت کے یہ الفاظ فضا میں بکھرے تو جدید سازوں کے سنگم پر شیخ ایاز کا یہ گیت اسے تڑپا گیا اور اسکی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اس نے شاہ لطیف کے سر ساموٹھی کا ایک بیت پڑھا۔

”اج پڑ والیوں کن، وٹجارا وٹجھن جون، جلن حارا سپریں، رُناں تال نہ رھن، آؤں جھلیدی کیترو؟ آئیل ساموٹھین، پگھ چھوڑے جن، ودھا بیڑا بار مٹیں۔“

(آج پھر سمندر کے سفر پہ جانے والوں نے اپنے بیڑے پانی میں چھوڑ دیئے ہیں اب وہ میرے رونے، یارو کنے سے بھلا کہاں ہیں رکنے والے۔)

فیضان نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”اتنا اداس نہ ہو مجھے مسکرا کر رخصت کرو ورنہ میرے دل پر بوجھ رہے گا۔“

رائیل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ لبوں پر مسکان تھی مگر آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے تھے۔ گیت کے الفاظ اور سران دونوں کے جذبات کی عکاسی کر رہے تھے۔ وہ دونوں کچھ کہہ ہی نہ سکے۔ کبھی کبھی خاموشی گفتگو کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بہت کہنا چاہتے تھے۔ سننا چاہتے تھے وہ جو ہو جانتے بھی تھے۔۔۔ کہنے اور







..... اور بہت کچھ۔

زارا نے الیم لائیک کیا اور لکھا: best wishes

اس نے دونوں کی کچھ تصویریں سیو save کیں رات تک وہ بار بار تصویریں دیکھتی رہی۔

ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے مسکراتے ہوئے پوز..... اس دن..... زارا کو پہلی مرتبہ دل میں کسک اٹھتے محسوس ہوئی۔-----

☆.....☆.....☆

فیضان امریکہ روانہ ہو چکا تھا۔ رائیل کا اس سے نیٹ پر رابطہ تھا۔ وہ اس سے باقاعدہ اس کی روٹین پوچھتا۔ رائیل نے خود کو سنبھال لیا تھا صبح یونیورسٹی کی جاب کی ذمہ داریاں نبھاتی اور بیٹھے میں دو تین دن شام کو "مشعل" کے آفس میں کام کرتی۔ اس نے پھر سے سیننگلز بنانے شروع کر دی تھی اور ایک دو گروپ شوز میں حصہ لے کے خوب داد پائی تھی اپنے فن پر یہ سب فیضان کی وجہ سے تھا۔ اگر وہ اس کی زندگی میں نہ آتا تو وہ تو ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔

"فیضان! پھر کب ملیں گے ہم؟" وہ اکثر یہی سوال دہراتی۔

"دعا کرنا..... اوہی ہوگا جو رب کریم نے ہماری تقدیروں میں لکھ دیا ہے۔ پھر ہم دور کہاں ہیں؟ ہر روز ہی تو رابطہ رہتا ہے..... اور دیکھو.... کبھی رابطہ نہ ہو پائے تو گھبرانا مت سمجھ لینا کی میں "ریج" میں نہیں ہوں۔"

وہ اس سے باتیں کرتا۔ اسے سمجھاتا..... بڑے دھیمے انداز میں پیار کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے "مشعل" کے پراجیکٹس کے بارے میں پوچھتا جہاں ضرورت ہوتی وہاں اس کی رہنمائی کرتا۔ پھر..... کچھ عرصے سے انٹرنیٹ پر اس سے رابطہ نہ ہو پایا۔ رائیل اس کی جدائی اور خاموشی سے گھبراتی تو کانوں میں فیضان کی آواز گونجتی۔۔۔

"محبت تو دور دلوں کا سنگم ہوتا ہے اور جب عشق اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو جسمانی فاصلے، گفتگو اور اظہار کی کوئی اہمیت نہیں رہتی عشق وہ بے خودی ہے جو ہر کوئی محسوس نہیں کر سکتا۔ میں اور تم الگ کہاں ہیں؟ میں تمہارے

وجود میں بستا ہوں اور تم میرے اندر ہو۔“

ایک دن اسے فیضان کی ایک طویل ای میل ملی۔ محبت کے بے حد اظہار کے بعد اس نے لکھا تھا۔۔۔

”میں جس مقصد سے یہاں آیا تھا اس میں کامیابی ہوئی ہے بہت جلد تمہیں ایک اچھی خبر ملے گی۔ میری طرف سے رابطہ نہ رہے تو پریشان مت ہونا اپنا بہت خیال رکھنا۔ اور۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ جو شام ہم نے گلابوں کی فصل میں ساتھ گزاری تھی اس منظر کی پینٹنگ ضرور بنانا وہ تمہارے اور میرے درمیاں روحانی عشق کی امین ہوگی۔ جب بھی اسے دیکھو گی، میرے وجود کو ساتھ کھڑے پاؤ گی۔ گلابوں کی خوشبو کو محسوس کرو گی پرندوں اور چوپایوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کے گیت سنو گی۔ یقین رکھو۔۔۔ تم ہو۔۔۔۔۔ تو میں ہوں۔۔۔۔۔“

رائیل نے اسکی یہ خواہش پوری کی۔ بڑی خوبصورت پینٹنگ بنا کر ڈرائنگ روم کی دیوار پر لگا دی۔ وہ جب بھی اسکے سامنے کھڑی ہو کر دیکھتی تو واقعی وہ سب محسوس کرتی جیسے فیضان نے کہا تھا۔



ویک اینڈ کو وہ علی حیدر کی شادی میں جانے کے لیے تیاری کر رہی تھی۔ خوبصورت سا جوڑا پریس کر لیا تھا۔ میچنگ سینڈل اور گولڈ کا خوبصورت نازک سا ہی سیٹ۔ مگر نہ جانے کیوں اسکا دل نہیں چاہ رہا تھا جانے کے لئے۔ حالانکہ آج شام تک ارادہ تھا۔ یونہی جانے اور نہ جانے کے تذبذب میں رات کے گیارہ بج گئے۔

”زارا! آپنی امی نے دال چاول بنائے ہیں آپ کیا کھانگی یا شادی میں جا کر کھانا کھائیں گی؟“

اچانک سائرہ نے آکر پوچھا تو اس نے ایک دم جیسے فیصلہ کر لیا۔

”ہاں! لے آؤ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں نہیں جا رہی دوا کی لے کر سو جاؤں گی تاکی جی کو کہنا اتنی بھی خراب نہیں کہ وہ پریشان ہو جائیں۔“

تھوڑی دیر میں سائرہ دال چاول لے آئی تاکی جی کی پکائی ہوئی دال کی خوشبو نے اس کی بھوک جگادی۔ وہ بڑے مزے کی دال بناتی تھیں۔ اس نے کھانا کھایا پھر بارہ بجے کے قریب بیڈ روم کی لائٹ آف کر کے بیڈ پر لیٹ گئی۔ نیند اسکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کروٹیں بدل رہی تھی یہاں تک کہ ساڑھے بارہ بجے حسب معمول لاؤنج میں بوا کے آنے، دروازہ بند کرنے اور لائٹ آف ہونے کا احساس ہوا اسے پھر بھی نیند

نہ آئی .... کیسے آتی؟ نکلیہ جو آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”کئی دن گزر گئے۔ فیضان نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ رائیل خود کو دن میں تو کام میں بہت مصروف رکھتی تھی مگر رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتی تو بند آنکھوں کے سامنے فیضان کی شکل گھومنے لگتی اس کے ساتھ بتائے ہوئے وقت کی یادیں ..... .. کانوں میں اس کی آواز گونجتی۔ نیٹ کے ذریعے کتنی ہی تصویریں اس کے پاس تھیں اور اسکی بھی وہ بھیجی صرف ایک ہی تصویر میں وہ دونوں مسکراتے ہوئے ایک ساتھ تھے.... شام کی جب فارم ہاؤس میں منعقدہ تقریب میں اسے ”مشعل“ کا چیئر پرسن بنایا گیا تھا.... وہی تو اس کا کل سرمایہ تھا۔

کبھی کبھی رات کو نیند سے جاگ جاتی۔۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔۔ فیضان اسے بلا رہا ہو.... اسکو اپنی سانسیں پھولتی محسوس ہوتی وہ پھر سونے کی کوشش کرتی تو اسے اپنی سانس گھٹتے ہوئے محسوس ہوتی.... وہ ڈھیر ساری دعائیں کرتی فیضان کی صحت اور بڑی عمر کے لئے۔ وہ تو اسکی روح میں بتا تھا۔ جیسے شاہ لطیف نے کسی کے لیے کہاں ہے اور پگل سرکار کا بھی یہی فلسفہ ہے:

”منھوں منھوں۔۔۔۔۔“ پکارتی ہوں

ایک بار جو جھانکا اپنے اندر

میں تو منھوں ہوں.....

میں خود سے انجان تھی

کہ میں نے اپنے اندر ہی نہیں جھانکا۔“

☆.....☆.....☆

دوسرے دن سنڈے تھا چھٹی تھی۔ سارا دن اسکا دل بے کل رہا ..... جیسے کچھ ٹوٹنے کا چھٹا کا..... جیسے اندھیرے میں جلتے ہوئے واحد دیپ بجھنے کا احساس۔۔۔۔۔

شام کو زینبیہ نے شادی کی تصویریں ایلوڈ کر دیں۔ یہ آج کل کی لڑکیاں اپنی تصویریں ... ہر ہر موقع کی ایلوڈ

کر دیتی ہیں۔ ڈھیروں تصویریں تھیں آف وائٹ خوبصورت شرارہ سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھی۔ علی حیدر نے نیوی بلیو تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ دونوں کی مسکراہٹیں تھی اور رومانٹک پوز..... دونوں بہت فچ رہے تھے اور مبارکبادوں کے ڈھیروں کمٹس اور بہت کچھ۔۔

"میڈ فار ایچ اور"

"ہینڈسم دولہا اور حسین دلہن۔"

"آئیڈل کیل....."..... وغیرہ

اس نے چند تصویریں save کی اور لاگ آؤٹ ہو گئی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس بات کا دکھ تھا..... علی حیدر سے شادی سے انکار اس نے خود کیا تھا.... پھر اب اس کے پہلو میں ہنستی مسکراتی زیدہ کو دیکھ کر دل میں کک کیوں اٹھ رہی تھی؟..... یا اسے یہ دکھ تھا کہ کچھ دنوں سے اس نے بالکل رابطہ ہی نہیں کیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان دنوں وہ بہت مصروف بھی ہے اور تصویروں میں بہت خوش بھی لگ رہا ہے۔

مگر یہ تصویریں اسے سمجھنی چاہئے تھیں۔ وہ شادی میں نہیں گئی.... اسے پتا بھی چلا ہوگا کہ نہیں۔۔ وہ پورا دن گزر گیا اور دوسرا بھی مگر علی نے اس کا حال پوچھا نہ اپنا حال بتایا۔

"نائم ملے تو مجھ سے بات کیجے گا۔" اس نے علی کو بیچ کیا۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اب زارا کا دل بھر آیا علی نے تو اسے اپنا عادی بنا دیا تھا سو اب اس کی خاموشی نے اسے بے گل کر دیا تھا کچھ دن اور گزر گئے آخر زارا نے ایک شام اسے کال کی۔

"علی کہاں ہو تم؟ کوئی خیر خبر نہیں ہے۔"

"یہی ہوں بھئی اور کہاں جاؤں گا۔"

"تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں شادی میں کیوں نہیں آئی تھی؟"

"ہاں بھئی۔ میں نے گھر والوں کو تمہارے بارے میں بتایا تھا تعارف کروا دیا تھا۔"

"تم نے مجھے تصویریں بھی نہیں بھیجی میں نے تو مہندی اور شادی کی تصویریں زیدہ کی وال پر دیکھی ہیں۔"

"تم تو ہر بات شیر کرتے تھے۔"

”بس ٹائم نہیں ملا!“

”تم خوش تو ہوتاں؟“

۴۰ - ۴۱

”اچانک پیچھے سے کوئی آواز آئی تو اس نے کہا

"میں اور زینبہ کہیں باہر جا رہے ہیں پھر بات کریں گے۔"

☆ ☆ ☆

ایک شام ایک گریس فل سی خاتون رائیل سے ملنے کے لیے آئیں۔ رائیل نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ان کے ساتھ نو دس سال کا ایک خوبصورت سا بچہ تھا جو فل سوٹ پہنے انگریز لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ رائیل کا دھیان خاتون کی طرف تھا جنہوں نے رائل بلیو کمر کی خوبصورت ساڑھی پہن رکھی تھی اور بالوں کا اسٹائلش قسم کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ رائیل اسے حیران ہو کر دیکھ رہی تھی۔

"میں مسز احمد ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی

”میں فیضان کی بڑی بہن ہوں اور امریکہ سے آئی ہوں۔“

”اوہ ..... آپ .....“ رائیل حیران بھی تھی اور بہت خوش بھی تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

"مجھے فیضان نے بھیجا ہے۔ آپ کو آپکی زندگی کی بہت بڑی خوشی دینے۔"

رائیل کا دل زور سے دھڑکا..... وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی.....

”اے پچانیں ..... یہ کون ہے؟“ وہ پیارے سے بچے کو اس کی طرف بھیجتے ہوئے بولیں۔

بچہ آہستہ آہستہ چل کر اس کے سامنے آیا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر آنکھوں سے لگائے اور چومے اور بڑی میٹھی آواز میں بولا

”آئی لو یومی i love you Mummy“

ایک دم جیسے روشنی کے حصار راتیل اور بچے کو گھیرے میں لے لیا اور وہ ایک دم اسے زور سے بھیجتے ہوئی روتی ہوئی ..... چومتی ہوئی بولتی رہی



"میرا بچہ..... میرا شان..... میری جان..... i love you too....."

اس جذباتی منظر کو دیکھ کر مسز احمد کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے۔ پورے گھر کو خبر ہو گئی پھپھو دوڑتی ہوئیں۔ اس نے بھی بچے کو گلے سے لگا لیا۔ بابا پیر واد اور گلاں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے..... اچانک اتنی بڑی خوشی جو ملی تھی۔

تھوڑی دیر میں بابا پیر واد چائے کے ساتھ کافی لوازمات لے آئے شان پھپھو کی گود میں تھا۔

"مگر..... یہ سب کیسے ہوا؟..... کا شان آپکو کیسے ملا؟ رائیل نے مسز احمد سے پوچھا۔

"رائیل! یہ بات لمبی کہانی ہے۔ امریکہ میں نیویارک جیسے شہر میں کسی کو اس طرح ڈھونڈنا آسان نہیں تھا..... لیکن فیضان پر تو ایک ہی جنون سوار تھا کہ کسی بھی طرح کا شان کو ڈھونڈ کر تمہارے پاس لاتا ہے۔ وہ تمہیں تمہاری زندگی کی بہت بڑی خوشی دینا چاہتا تھا۔"

"مگر..... اس کا باپ کیسے راضی ہوا وہ تو بہت کھورا انسان ہے۔"

"اس نے وہاں ایک امریکن خاتون سے شادی کر لی ہے جس سے اس کے دو بچے ہیں۔ وہ کا شان کو رکھنے کے حق میں نہیں تھی اسلئے اس نے اسے وہاں اپنی بہن کے پاس رکھا ہوا تھا۔ یہ ان کی فیملی کے ساتھ تھا۔ فیضان نے اس کو آخر کار قائل کر ہی لیا کہ کا شان کا بہتر مستقبل صرف اسکی سگی ماں کے پاس ہی ہے اب تو موصوف کے دماغ بھی ٹھکانے آچکے ہیں۔ مشرقی بیویوں پر رعب جمائے والے امریکن یا یورپیٹین بیویوں سے سیدھے ہوتے ہیں۔ اسکی بیوی بھی جاب کرتی ہے۔ گھر آ کر اسے بھی اس کے ساتھ مل کر گھر کا کام کرنا ہوتا ہے..... برتن بھی دھونے پڑتے ہیں اور بچوں کو بھی سنبالنا ہوتا ہے۔ بہر حال..... وہ اپنی زندگی میں سیٹ ہے۔ البتہ کا شان بہت حساس بچہ ہے وہ پھپھو کی فیملی میں سیٹ نہیں تھا بہت ڈسٹرب تھا۔ میں نے کافی دن اسے اپنے پاس رکھا اور..... دیکھا..... اس نے کیسے تمہیں پہچان لیا..... میں نے اسے تمہاری تصویریں دکھائی تھیں اور بہت کچھ بتایا ہے۔" مسز احمد بولیں۔

رائیل سمجھ گئی کہ جس طرح سے وہ اسکے ہاتھوں کو پکڑ کر، چوم کر ملا تھا..... یہ سب ٹریننگ اسے مسز احمد نے دی تھی۔ مگر..... اب..... وہ اس سے فیضان کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ خود اٹھ کر اس کے

قریب صوفے پر بیٹھ گئی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

”فیضان کو تمہاری تنہائی اور پریشانی کا بہت احساس تھا.... وہ تم سے شادی اس لئے نہ کر سکا کہ اسے پتا تھا کہ وہ زیادہ وقت تمہارے ساتھ نہ رہ سکے گا..... اسے تم سے بے انتہا پیار تھا..... وہ تمہارا بہت ذکر کرتا تھا.... اور تم تو ہو بھی ویسے پیاری جیسا وہ بیان کرتا تھا.... بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیاری ہو..... کہ..... میں... تو تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے فیضان کی دلہن بنا کر لاتی..... مگر..... اس کی زندگی نے وفاندگی..... وہ اس بار کینسر سے ہار گیا.....“

کہتے ہوئے وہ ہلکے ہلکے کر رو پڑیں اور رائیل کو تو درد یوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے..... اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر گر پڑی۔

☆.....☆.....☆

کئی دن گزر گئے۔ نہ تو علی حیدر نے اس سے رابطہ کیا نہ کسی میسج کا جواب دیا۔ زینہ ہر دوسرے دن تصویریں اپلوڈ کرتی۔ دونوں ہنستے مسکراتے کسی ہوٹل میں ڈنر کر رہے ہیں یا تفریحی مقام پر گھوم رہے ہیں اوپر کپشن ہوتے:-

”مائی ہسبند“ my husband

”مائی لوو“ my love

”لو یو“..... love you

زارا سمجھ گئی کہ وہ بھی حسین کی طرح ہی نکلا..... فرق یہ تھا کہ علی حیدر آخر تک اسے شادی کیلئے کہتا رہا..... ایک مرتبہ پھر اسے لگا کے اسے ٹھکرایا گیا تھا..... اس احساس ذلت نے اسے بے چین کر دیا..... یہ وہ احساس ہے جو عورت کو بہت تکلیف دیتا ہے کہ لیڈی ڈانسا جیسی خاتون اپنی جان پر کھیل گئی۔ اس نے زینہ کو ہی ہلاک کر دیا۔ وہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی ان کی تصویریں۔ ایک مرتبہ اس نے غصے میں آ کر علی حیدر کو اسی کے بھیجے ہوئے رومینگ میسجز بھیجے تو گھبرا کر اس نے کال کی۔۔۔

”زارا! تم ہوش میں تو ہو؟ اگر یہ میسجز میری وائف دیکھ لے تو اس کا انجام سمجھتی ہو؟“

”میں نے تو صرف آپکو آپکے کہے ہوئے الفاظ یاد دلوائے ہیں۔ گھبرا کیوں گئے؟“

”تم پاگل ہو گئی ہو۔“ وہ چیخا۔

”کل تک میں تمہارے دل کی رانی تھی آج پاگل ہو گئی؟“

☆.....☆.....☆

جانے والوں کو کون روک سکتا ہے۔ وہ کیسے فیضان کو روک سکتی تھی؟ اس دن مسز احمد نے اس سے بہت باتیں کیں۔۔۔۔۔ فیضان کے بارے میں جس نے اس کے سپرد کاشان کو کیا تھا۔۔۔ وہ بچہ جو رائیل کو جینے کے لئے مجبور کرے گا وہ تو ہوش و حواس سے جیسے بیگانہ ہو گئی تھی اس دن خبر سن کر۔ مسز احمد نے بتایا۔

”میں جانتی ہوں کہ اس نے تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا ہوگا۔۔۔ وہ ایسا ہی تھا پھر وہ تمہیں دکھی کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اسے کچھ سال پہلے بلڈ کینسر ہو گیا تھا۔ امریکہ میں اس کا علاج چلا۔ بیماری ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی اس لئے کنٹرول ہو گئی مگر ڈاکٹر ذرا بھی تک مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے اس لئے فالو اپس جاری تھے۔ پھر اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ شاید زندگی اسے پھر مہلت دے یا نہیں، اس پر اس کی مٹی کا قرض تھا۔ وہ اپنے لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ اپنی دھرتی کی طرف لوٹ آیا۔ دن رات ایک کر کے فلاجی ٹرسٹ“ مشعل“ کو بنانے کے بعد اسے اطمینان ہوا جب اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی تو وہ ذمہ داری تمہارے حوالے کر آیا۔۔۔ رائیل!۔۔۔ اس مشعل کو تمہیں روشن رکھنا ہے۔۔۔ اس کے مشن کو جاری رکھنا ہے۔ اسی میں اس کی روح کو سکون ملے گا۔“

”وہ اتنی تکلیف میں رہا اور مجھے کسی نے نہیں بتایا۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ مجھے پکارتا تھا۔۔۔ مجھے یاد کرتا تھا۔۔۔ میں محسوس کرتی تھی اس کی تکلیف کو۔۔۔ لیکن۔۔۔ میں تو اس کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔ وہ مجھے تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہے“

وہ بلک بلک کر رو دی تب مسز احمد نے کاشان کا ننھا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھما کر کہا۔

”تنہا کہاں چھوڑا ہے؟ تمہیں تمہارا مستقبل دیا ہے۔ میں اتنی دور سے یہ امانت ہی تو دینے آئی ہوں“

رائیل نے کاشان کو بھیج کر پیار کیا۔ مسز احمد چلی گئیں گھر۔ گھر میں کاشان کے آنے کی خوشیاں منائی جا رہی

تھیں۔ پھپھو اسے خود سے دور ہی نہیں کر پار ہی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر وہ سب سے کھل مل گیا تھا۔

رائیل ڈرائنگ روم میں لگی بڑی سی خوبصورت پینٹنگ کے سامنے آکھڑی ہوئی جو اس نے فیضان کی فرمائش پر بنائی تھی۔۔۔ جب ایکدم ہی لان کی طرف کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا زوردار جھوٹکا اپنے ساتھ جیسے گلابوں کی خوشبو ساتھ لے آیا۔۔۔ اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں تو کانوں میں گھنٹیوں کی آوازیں گونجنے لگیں اس نے بند آنکھوں سے منظر دیکھا۔۔۔ گلابوں کی فصل کے پیچھے ڈوبتا ہوا سورج۔۔۔ گھروں کو لوٹنے والے پرندوں کے غول، چرواہے بکریوں اور بھیڑوں کو لے کر جاتے ہوئے اور وہاں کھڑے رائیل اور فیضان۔۔۔ رائیل کے ہاتھ میں خوبصورت سی گھڑی ..... جس میں وہ وقت محفوظ تھا..... وقت ٹھہر گیا تھا۔ فیضان نے اسے بتا دیا تھا کہ عشق کیا ہوتا ہے۔۔۔

☆.....☆.....☆

وہ بھی بہت ہرٹ ہو گئی تھی۔ دل گھبراتا تو سینکڑوں کی تعداد میں علی حیدر کے بھیجے ہوئے محبت بھرے پیغامات پڑھتی۔ اسے علی حیدر کے بدلے ہوئے رویے نے بہت دکھ پہنچایا تھا۔ اور پھر وہ جنون میں اسے یاد دلانے کے لئے اسی کے میسجس اسی کو بھیجتی۔

"تم سائیکو ہو۔ علاج کرواؤ اپنا"

"تم سے میری خوشیاں برداشت نہیں ہو رہیں۔"

"تم میرا گھر لگانا چاہتی ہو۔"

اگر وہ ایک مرتبہ بھی ناظم نکال کر اس سے بات کر لیتا تو اسے اطمینان ہو جاتا۔ وہ ایسی بھی نہیں تھی۔ نہ اسے علی حیدر کی خوشیوں سے کوئی رنج تھا نہ ہی وہ اس کا گھر بگڑنے کا سوچ بھی سکتی تھی۔ مگر اس نے تو شادی کو چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی کبھی اس کی خبر نہیں پوچھی تھی۔ یہ ہوتے ہیں مرد۔۔۔ ہزاروں دھوئے عشق کے اور پھر نظریں پھرتے دیر ہی نہیں لگتی۔ پھر اگر وہ آرام سے بات کر لیتا تو شاید وہ اتنے غصے میں نہ آتی مگر الٹا اسی کو برے طریقے سے کہتا۔۔۔

"تم سائیکو ہو علاج کرواؤ اپنا"



"تمہاری ذہنی حالت نارمل نہیں۔"

"پاکل ہو"

"سائیکو ہو۔"

"علاج کراؤ واپس....."

ان جملوں نے اسے جنون میں مبتلا کر دیا۔ حسین نے ایک مرتبہ اسکی توہین کی تھی محبت کا دعویٰ کر کے ....  
آج علی حیدر بھی اس کے ساتھ یہی کچھ کر رہا تھا۔

فرق یہ تھا کہ حسین اس سے چھپتا تھا ... اس سے خاموشی سے جدا ہو گیا تھا ... اسے کوئی بھی غیر مہذب جملہ نہیں کہا تھا مگر .... یہ علی حیدر .... اس کا رویہ تو انتہائی جارحانہ اور گستاخانہ تھا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ حسین اس کے قابل نہ تھا مگر آج زارا کو احساس ہوا کہ علی حیدر اس قابل نہ تھا۔ اسے شدید صدمہ ہوا اس نے سوچا کہ یہ خود کو سمجھتا کیا ہے؟ "میں بھی سیدھا اس کے گھر جاؤں گی اور اس کی بیوی کو دکھاؤں گی وہ سینکڑوں میسجز جو علی حیدر نے سالوں سے اسے بھیجے تھے۔ ان پر تار بنیں بھی تھیں۔ وہ کوئی عام عورت نہیں تھی کہ علی حیدر اس طرح سے اسکی توہین کرے۔ دیکھتی ہوں کہ یہ تمام میسجز دیکھنے کے بعد بھی محترمہ زیہ "لو یو love u کی رٹ لگاتی ہے۔ اس کے ذہن میں جیسے آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس نے اپنا ہنڈ بیگ اٹھایا اس میں موبائل رکھا اور کار گیراج سے نکال کر علی حیدر کے گھر کی طرف رخ کیا۔

☆.....☆.....☆

شان کے آنے کے بعد رائیل کے گھر کا ماحول ہی بدل گیا .... بلکہ اب یہ 'گھر' لگتا اسے۔ رائیل نے اسے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ روز صبح اسے خود اسکول چھوڑ کر پھر یونیورسٹی چلی جاتی جہاں اب وہ آرٹ کے شعبے کے پروفیسر تھی۔ شام کو وہ "مشعل" کی ذمہ داریاں سنبھالتی۔ فیضان کے خواب کو تعبیر مل گئی تھی۔ فلاحی کام بھی چل پڑے تھے اور آرٹ اور ادب کے پروگرام بھی۔ اب تو رائیل بہت نامور شخصیتوں میں شمار ہوتی تھی۔ آرٹ کی دنیا میں بھی بہت کام کر رہی تھی۔ اسکی پینٹنگز کی نمائش ہوتی رہتی تھیں۔ فیضان خوشبو کے معطر جھونکے کی طرح اس کی زندگی میں آیا تھا اور اسکی زندگی محبت سے مسور کر گیا۔ آج بھی اسے بہت اہم پروگرام میں جانا تھا



۔ "مشعل" کے پلیٹ فارم سے ایک نئی ٹیلنٹڈ آرٹسٹ کی تصویروں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔

وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر آئی۔ بہت ہی خوبصورت اور گرلیس فل لگ رہی تھی۔ برآمدے میں گلاں کی سبزیوں کے کاٹنے کی نگرانی کرتی ہوئی پھپھو نے اسکی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ لان میں کاشان گلاں کے بیٹے کے ساتھ بال سے کھیل رہا تھا۔ بابا پیر وریفری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

"زندگی تمہارے لئے ہے۔" فیضان کی سرگوشی اس کے کانوں میں سنائی دی۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ جب وہ آڈیٹوریم میں پہنچی تو ہال مہمانوں اور میڈیا کے لوگوں سے بھر چکا تھا۔

جب اسے سٹیج پر بلایا گیا تو سب اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ فلاحی کاموں کی وجہ سے لوگ اس سے بہت محبت کرتے اور احترام کرتے۔ نئی آرٹسٹ کو بھی سٹیج پر بلایا گیا تو ایک نازک اور خوبصورت سی لڑکی تالیوں کی گونج میں سٹیج پر پہنچی فن کے ناقدین نے فائزہ حسین کے فن پر روشنی ڈالی۔ پھر اسے ڈانس پر بلایا گیا۔ وہ بہت با اعتماد لڑکی تھی۔ جب وہ بولی تو سب اس کی باتوں کو خاموشی سے سن رہے تھے

"میں .... فائزہ حسن! .... جس مقام پر ہوں اسکا سارا کریڈٹ میں اپنے شوہر حسن کو دوں گی۔ جنہوں نے ہر قدم پر میرا بھرپور ساتھ دیا۔ انہوں نے میری تخلیقی صلاحیتوں کو دوبانے کے کی بجائے میری ہمت افزائی کی۔ ہمارے معاشرے میں کسی بھی شعبے میں کام کرنے کے لیے جب لڑکیاں باہر آتی ہیں تو ان کا واسطہ ہر قسم کے لوگوں سے پڑتا ہے جن میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی میرے ساتھ بھی ایسا ہوا مجھے اپنے کام کے سلسلے میں مختلف لوگوں سے ملنا پڑتا ہے اور شہر سے باہر بھی جانا پڑتا میرے لئے اکیلے یہ سب کرنا بہت مشکل ہوتا مگر حسن ہر قدم پر میرے ساتھ رہے اپنے کام کی وجہ سے میں نے کبھی گھر کی ذمہ داریاں بھی دھیان سے پوری نہ کی ہوں گی تو کبھی بچوں کی بھی مگر اس سلسلے میں حسن کبھی مجھ سے ناراض نہ ہوئے بلکہ میری مدد کی۔ جب پرنٹ میڈیا میں میرے انٹرویو چھپتے ہیں یا ٹی وی چینلوں پر بلایا جاتا ہے تو عام مردوں کی طرح react کرنے کے بجائے وہ میری کامیابیوں پر خوش ہوتے ہیں۔ .... آپ بھی حیران ہوں گئے میں تو صرف اپنے شوہر کا تذکرہ لے کر بیٹھ گئی .... وہ اسلئے کہ میں بتانا چاہتی ہوں کہ جب تک ہم لڑکیوں کو ہمارے گھر کے مردوں کی طرف سے سپورٹ اور اعتماد نہ ملے گا وہ کچھ بھی نہ کر پائیں گی .... پتا نہیں کتنی ٹیلنٹڈ لڑکیاں اس لیے اپنی منزل

نہیں پاسکی کیونکہ ان کے بھائی باپ یا شوہران کو وہ اعتماد اور تعاون نہیں دیتے جن کی ان کو ضرورت ہے۔ یاد رکھیں .... جن خواتین کے ساتھ ان کے اپنے پیارے رشتے باپ بھائی اور شوہر ساتھ ہوں تو کسی کی مجال نہیں کہ انکی طرف بری نگاہ سے بھی دیکھ سکے آخر میں شاہ لطیف کے ایک بیت کے مفہوم پر اپنی بات ختم کروں گی کہ۔

”خاوند تو دوسروں کے بھی ہیں، مگر میرا

محبوب دوسروں سے مختلف ہے،

وہ تو میرے صیہوں کی پردہ پوشی کرتا

ہے خدا کی طرح:“

سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا آخر میں راتیل کو ڈانس پر بلایا گیا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی:

”فائزہ حسن، نوجوان خوبصورت ابھرتی ہوئی آرٹسٹ ہے..... اس کے ساتھ بہت پیار کرنے والی بیوی اور ماں بھی ہے۔ اس کی کامیابی کا سبب آپ اسی کی زبانی سن چکے ہیں۔ اس کم عمری میں اتنا اچھا کام دیکھ کر میں حیران ہوئی ہوں۔ اس نے معاشرے کے سنگتے ہوئے موضوعات پر بہت گہرا کام کیا ہے۔ اس کے موضوعات مختلف ہیں۔ دہشتگردی سے لے کر خواتین کے مسائل اور نیچر سے لے کر کلچر تک .... اس نے ہر موضوع سے انصاف کیا ہے۔

ابھی میں نے فائزہ کو بولتے ہوئے سنا اور دیکھا تو مجھے خود اپنی ذات کا تسلسل لگی فرق یہ ہے کہ جب میں اس شعبے میں آئی تھی اس دور اور اس وقت میں لوگوں کی سوچ اور رویوں میں تبدیلی آچکی ہے۔ اب ادب، آرٹ، اور میڈیا کے شعبے میں کام کرنے والی خواتین کو بہتر ماحول مل رہا ہے۔ ان کو آگے لایا جا رہا تھا.... ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ آج جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ دنیا ایک گلوبل وِلج (global village) میں تبدیل ہو گئی ہے..... وہاں ہمیں اپنی سوچ اور رویوں میں تبدیلی لانی ہوگی .... مثبت تبدیلی۔ اب تسلیم کرنا ہے کہ عورت commodity یا غلام نہیں مگر جیتی جاگتی انسان ہے۔ اس کی سوچ ہے، خواب ہیں، خواہشیں ہیں، اپنی شخصیت ہے اسکو قبول کرنا ہوگا..... پھر چاہے کوئی خوشی سے کرے یا مجبوری سے .... کیونکہ تبدیلی کے عمل کو کوئی روک نہیں سکتا تو پھر مثبت تبدیلی میں ہم سواپنا حصہ

کیوں نہ ڈالیں؟ ..... شکریہ!

پھر تصویروں کی نمائش کا افتتاح ہوا میڈیا کے نمائندے بھرپور کوریج کر رہے تھے بہت کامیاب نمائش رہی۔ جب رائیل گھر جانے کے لیے ہال سے نکل کر لان میں آئی تو فائزہ حسن بھی اسکو گیٹ تک چھوڑنے کے لیے ساتھ آئی اور کہا۔

"میڈم! آپ نے آج" مشعل" کی طرف سے میرے اعزاز میں اتنا خوبصورت پروگرام اور نمائش کا انتظام کیا اس کے لئے میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے شکریہ ادا کرو..... میں تو خود آپ کو اپنا آئیڈیل سمجھتی ہوں۔"

یہ تو" مشعل" کے مشن میں سے ایک ہے شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں رائیل نے مسکرا کر کہا۔ اور اپنا پرس کھول کر ٹشو پیپر نکالا تو اس میں سے ایک خوبصورت نازک گولڈن واچ گر پڑی جسے فوراً اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا:

"میڈم آپ کی گھڑی ..... گرنے کی وجہ سے شاید بند ہوگئی ہے۔"

"نہیں اس نے وقت کو روک دیا ہے اس نائم کو محفوظ کر دیا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں میم؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"فائزہ تم نے حسن سے محبت کی ہے ناں؟"

"میم مجھے حسن سے بے پناہ محبت ہے اور اسے بھی۔ ہم خوش نصیب ہیں کہ ایک دوسرے کو اپنایا بھی ہے۔"

"پھر وہ تھوڑا الٹا الٹا کر بولی: میم آپ نے بھی کسی کو اتنا چاہا ہے؟"

"عشق کا مفہوم سمجھتی ہو؟ اپنا نا کیا ہوتا ہے؟ ..... شادی کرنا.....؟ ..... عشق تو روجوں کا ملاپ ہوتا

ہے..... ہاں .... میں نے عشق کیا ہے۔"

اچانک ہوا کا ایک تیز خوشگوار جھونکا ان کے وجود کو روح تک سرشار کر گیا۔

"میم کون ہے وہ خوش نصیب؟ کیا آپ نے اسے پایا۔"

"ہاں ..... فائزہ ..... دیکھو ..... محسوس کرو ..... چاندنی پہلے سے زیادہ گہری ہوگئی ہے ناں"

"ہاں ..... شاید....."

"محسوس کرو... ہوا کے جھونکوں میں گلابوں کی خوشبو .. سنو... گھنٹیوں کی سریلی آواز... وہ یہیں ہے"

"میم کہاں ہے کون ہے۔"

"یہ روح کے رشتے ہیں ان کو ہر کوئی محسوس نہیں کر سکتا.... دیکھ نہیں سکتا...."

اس نے محبت سے واج کو ہاتھوں میں پکڑا اور فائزہ کو حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

جب وہ علی حیدر کے گھر کے موڑ پر پہنچی تو ایک جھٹکے سے گاڑی کو بریک لگایا اور روک دیا۔ اس وقت اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی چہرہ پسینے اور آنسوؤں سے تر تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ہینڈ بیک سے موبائل نکالا علی حیدر کے میج کو دیکھنے لگی۔

"یہ میں کیا کر رہی ہوں؟"

"اس لڑکی کا کیا قصور.....؟"

"میں کیوں کسی کا گھر برباد کروں؟"

"علی حیدر تو میرا دوست ہے....."

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سارے میجور ڈیلیٹ کر دیئے اور اسٹیرنگ پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اس کی کار کے شیشے سیاہ تھے اور اتنا ٹریفک نہیں تھا کہ کوئی اسکے اس طرح رونے کو نوٹس کرتا۔ اس کے کانوں میں علی حیدر کے کہے ہوئے دل کو چیرنے والے جملے پھر سے گونجنے لگے۔

"تم پاگل ہو..... سائیکو ہو..... علاج کراؤ اپنا....."

"ہاں میں پاگل ہوں .... سائیکو ہوں ..... مجھے اپنا علاج کروانا چاہیے۔"

اس نے جھٹکے سے گاڑی کو سٹارٹ کر کے یوٹرن لیا اور Assylum lunatic (پاگل خانے) کی طرف جانے لگی۔

☆.....☆.....☆



رائیل نے زارا سے سب کچھ معلوم کر لیا تھا۔ وہ نہ صرف یونیورسٹی کے دور میں یونیورسٹی فیلوز تھیں انہوں نے

### 'art & literacy society'

کے پلیٹ فارم سے مل کر یادگار ایونٹ کیے تھے۔ کہیں نہ کہیں ان دونوں کا آمنا سامنا ہوتا رہا تھا۔ اسے بہت دکھ تھا کہ زارا اس حال کو پہنچ گئی تھی۔

اس نے ویڈیو ریکارڈنگ علی حیدر کو واٹس ایپ کر کے لکھا تھا۔

”زارا کی اس حالت کے ذمہ دار تم ہو علی حیدر تم اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ پہلے سے کس ٹریجڈی سے گزر چکی تھی پھر بھی تم نے اس کو یوں توڑ دیا۔ عورت نا تو پتھر ہوتی ہے نہ کھلونا .... بہت حساس ہوتی ہے خاص طور پر ایک حساس آرٹسٹ ہو کہ لکھاری۔“

اسی رات وہ رائیل کے گھر پر آیا تھا زارا سے ملنے مگر ابھی زارا زیر علاج تھی اور اس وقت سو رہی تھی اسلئے رائیل نے صرف دور سے اسے زارا کو دیکھنے کے لیے کہا۔ وہ سو رہی تھی۔ چہرہ پر سکون تھا۔ اسے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا دل چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ہمیشہ کی طرح اس پر رعب جما کر کہیے۔“

”اٹھو زارا .... چلو میرے ساتھ۔“

وہ خود بھی بہت بکھرا بکھرا سا تھا۔ ویڈیو دیکھنے کے بعد اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کیا کر چکا تھا۔

اس نے رائیل سے بہت باتیں کی .... اپنے بارے میں اور زارا کے بارے میں۔“

☆.....☆.....☆

”زارا اعلیٰ رات کو آیا تھا بہت بکھرا ہوا تھا وہ بھی۔“

زارا نے کوئی جواب نہیں دیا بس خالی خالی نظروں سے دیوار کو تکی رہی۔

”زارا! تم نے بھی تو اپنے دل کی بات نہیں سنی۔ تم اس سے محبت کرنے لگیں تھی مگر انکاری رہیں۔ سبب میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔“

رائیل اس کے قریب بیٹھی دھیرج سے کہہ رہی تھی۔ اس کی بات سن کر زارا کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے



آنسوؤں کے قطرے ٹپکے مگر وہ اسی طرح بے جان بنی سامنے دیکھتی رہی۔

"کچھ زیادتی تم بھی کر چکی ہو۔ تم اپنے دل کی بیقراری سے گھبرا گئیں..... اسے تھوڑا سا نادم تو دیتیں۔ اس کو نئی زندگی میں ایڈجسٹ تو کر لینے دیتی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وہ تم سے مخلص نہیں مگر تمہارے رویے سے وہ گھبرا گیا تھا۔ وہ رشتہ نبھانے والا شخص ہے حسین کی طرح رشتہ بنا کر توڑنے والا نہیں ہے۔"

اب زارا نے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ رائیل نے اسے ہانپوں میں لے لیا۔ وہ اس کے کندھے سے لگی روتی رہی رائیل نے سوچا یہ رونا اس کے لیے بے حد ضروری ہے۔

☆.....☆.....☆

"زارا! میں نے ایک مرتبہ تم سے پوچھا تھا کہ تمہیں 'شاہ جو رسالو' کا کونسا سُر پسند ہے تو یاد ہے ناں تم نے کیا کہا تھا؟"

زارا کو 'شاہ جو رسالو' کا مطالعہ کرتے دیکھ کر رائیل نے پوچھا جو اس کے بیڈ کے قریب آ کر بیٹھی تھی۔

"ہاں! مجھے 'سر رامکھی' پسند ہے۔"

"کیوں.... یہ سہی کیوں؟"

"اس لیے کہ اس میں جوگی اور سامی فقیروں کا ذکر ہے جو سماجی رشتوں اور تعلقات سے دور ہو کر جوگ لے کر جنگلوں اور بیابانوں میں پھرتے ہیں۔ اپنے نفس کو قابو کرتے ہیں۔"

"اور.....؟" رائیل نے پوچھا۔

"میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں جوگ لے لوں۔ اس سماج سے نانا توڑ دوں..... میں جب بھی اس سر کو پڑھتی ہوں جس میں شاہ سائیں نے بتایا ہے کہ جوگی فقیر جنگلوں اور بیابانوں میں بیٹھے ہوتے ہیں تو مجھے ہمیشہ یہ لگا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہوں..... جوگن کے روپ میں۔"

"تم نے شاہ جو رسالو پڑھنے کے بعد یہ نہیں سوچا کہ شاہ لطیف سندھ دھرتی کے پہلے feminist شاعر تھے۔ اس نے عورت کو بہادری، وفا اور عاجزی کا پیکر بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ ماؤڈی ہے جو وطن کی محبت میں شاہی محل کی ملکہ بننے سے انکار کر کے طیر جانا چاہتی ہے وہ کسی کی طرح اپنے محبوب کی تلاش میں اکیلی

جنگلوں بیابانوں اور پہاڑی راستوں سے گزرتی ہے۔ وہ سونہی کی طرح محبوب سے ملنے کے لیے گھڑے کی مدد سے دریا پار کر کے جاتی ہے، نہ دریا کی موجوں سے ڈرتی ہے نہ طوفانوں سے، وہ موٹ کی طرح اپنے محبوب کی غلط فہمی ختم کرنے کے لیے قریہ قریہ گھوم کر اس کے پاس پہنچتی ہے، وہ سورٹھ کی طرح اپنے محبوب شوہر کی جان بچانے کے لیے کوشش کرتی ہے، لیلہ کی طرح اپنی غلطی کو مان کر عاجزی سے معافی طلب کرتی ہے اور وہ نوری کی طرح سادگی اور عاجزی سے زندگی گزارتی ہے ملکہ بننے کے بعد بھی ..... یہ سب جدوجہد کرتی ہے..... شاہ نے اسی لیے عورت کو سورمیاں "heroines" بنا کر پیش کیا مگر جو گن نہیں دکھایا۔

"صحیح کہتی ہیں آپ رائیل ..... لیکن میں کبھی کبھی یہی سوچتی ہوں کہ قیس لیلیٰ کی محبت میں مجنوں بن گیا، فرہاد نے پہاڑ سے ہتھوڑے سے پتھروں کو توڑ کر 'شیریں' کے عشق میں نہر نکال دکھائی اور تو اور مغرب میں شاہی خاندان کے ایک شہزادے نے ایک عام لڑکی کی عشق میں شاہی آداب کے مطابق تخت و تاج چھوڑ دیا اور پیرس میں اسی لڑکی کے ساتھ ساری عمر گزار دی اور اب ..... شہزادہ ہیری نے خود سے تین سال بڑی، سانولی اور طلاق یافتہ عورت سے شادی کر کے شاہی خاندان کا حصہ بنا دیا لیکن میں نے پاک و ہند کے مردوں کو محبت کے معاملے میں بھی اتنا پرست دیکھا ہے اور یہاں بھی وہ 'مردانہ برتری' کا قائل ہے۔ وہ خود قربانی نہیں دیتا نہ ہی عشق کے امتحانوں سے گزرتا ہے بلکہ قربانی صرف عورت سے ہی مانگتا ہے۔"

"وہ کیسے بھلا؟" رائیل مسکرا کر بولی۔ وہ اسے ایسے بولتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔

"رائیل دیکھیں ناں جب ماروئی نے اپنی عزت و توقیر کو قائم رکھتے ہوئے شاہانہ زندگی کو ٹھکرا دیا تو اس کی وطن کی محبت کو دیکھتے ہوئے عمر بادشاہ نے اسے قید سے آزاد کر کے اپنے وطن ملیر (تھر) بھیج دیا تو وہاں کے لوگوں نے اس سے اس کی پاکبازی کا ثبوت دینے کے لئے رسم کے مطابق بھڑکتی ہوئی آگ سے گزرنے کے لئے کہا اور اسے اس امتحان سے گزرنے پڑا اور زندہ نکل آئی ..... مگر اس وقت کھیت کہاں تھا؟ جو اسکی محبت تھا.... اسکا منگیتر تھا..... اس نے اسے آگ سے گزرنے کیوں دیا؟ اسے بھی شک تھا..... ہاں مرد شک ہی کرتا ہے۔"

اوہو! ..... میں یہ پوائنٹ تو پہلی مرتبہ سن رہی ہوں۔" رائیل مسکرا کر بولی۔

"اگر انھوں کسی سے شادی کرنے کے بعد اتنا حوصلہ رکھتا کہ اس کو عزت و احترام سے بیوی کی حیثیت

سے اپنے دولت مند باپ کے پاس بلوچستان لے جاتا اور وہ قبول نہ کرتا تو برطانوی شہزادے کی طرح اسکی دولت کو لات مار کر کسی کو اپنی محنت کی روزی کھلاتا مگر وہ تو کسی کے گھر ہی پڑا رہ گیا اسی لئے اس کے باپ نے اس کے بھائیوں کے ذریعے اسے کڈنیپ (اغوا) کروا کر واپس بلایا تو بیچاری کسی کو جنگلوں ویرانوں اور پہاڑوں سے گزرنا پڑا کیونکہ وہ کیچ مکران بلوچستان جانا چاہتی تھی بھنبھور سے اور پھر راستے میں اپنی عزت بچانے کے لئے اللہ سے التجا کی اور زمین پھٹ گئی وہ اس کے اندر چلی گئی... یعنی عشق نے اسے زندہ دفن کر دیا۔"

"مگر یہ مت بھولو کہ انھوں وفادار تھا۔ جیسے ہی ہوش میں آیا وہ بھی کسی کی طرف آیا اور راستے میں پتہ چلا کہ وہ مر چکی ہے تو اس نے بھی صدے سے جان دے دی۔"

"وفادار تھا مگر باہمت نہیں تھا۔"

"اچھا جی!"

"پھر..... یہ ہماری مول رانوں نے مول کے ساتھ مردانہ کپڑوں میں اسکی بہن سول کو سوتے دیکھا تو اسے مرد سمجھ کر غیرت آئی اور اسے چھوڑ دیا۔ وہ بیچاری مردانہ بھیس بدل کر رانوں کے گھر میں آئی اور سب کچھ بتایا مگر اس نے اعتبار نہ کیا.... آخر دلیرداشتہ ہو کر مول نے خود کو مار دیا تو رانوں نے بھی خود کو مار دیا..... شک.... مرد عورت کی وفا پر شک کرتا ہے وہ قربانی دیتی ہے"

"ہوں!"

"نوری صاحبہ کو میک اپ اور جیولری کا شوق نہیں تھا... وہ ہمیشہ سادہ رہے پھر بھی جام تماچچی اسے دوسری رانیوں کی نسبت زیادہ چاہتا تھا سبب اس کا حسن تھا۔ شکر ہے اس کہانی میں اس نے اس سے محبت کی اور چھیرن سے ملکہ بنایا مگر یہاں نہ ظالم سماج تھا نہ ماں باپ کا پنچا لہذا قربانی تو کوئی نہیں دی۔"

اب رائیل اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

"اب آجائیں سورٹھ پر..... یہ کوئی رومانی کہانی نہیں جب بچل راہ ڈیا ج کو مارنا چاہتا ہے تو اس نے شوہر کو بچانے کے لئے کوشش کی اور نا کام رہی تو خود کو مار دیا..... عورت ہے ہی وفا کا پیکر۔"

اور؟

"اب آجائیں 'لیلا چنسر' پر۔ لیلیٰ نے غلطی کی کہ ایک قیمتی ہار کے بدلے ایک رات کے لئے اپنے شوہر کو دوسری عورت کے حوالے کر دیا نشہ دے کر۔ جب وہ دوسرے دن ہوش میں آیا تو سب کچھ جان کر اسقدر غیرت میں آیا کہ لیلیٰ کو دھکے دے کر محل سے نکال باہر کیا جب کہ وہ اپنی غلطی کا اقرار کرتے ہوئے رورو کر معافی مانگتی رہی۔ عورت مرد کی کتنی غلطیوں کو معاف کر دیتی ہے مگر مرد نہیں کرتا۔ یہی کام مرد اپنی مرضی سے کرتا ہے تو بیوی کو درگزر کرنا پڑتا ہے یا بادشاہوں کی ایسی روش کو ملکا میں برداشت کرتی ہیں مگر وہ لیلیٰ کی طرح غلطی کا اقرار بھی نہیں کرتے، شرمندہ بھی نہیں ہوتے معافی مانگنا تو اور بات۔"

"تم تو پکی افسانہ نگار بن گئی ہو بھئی۔"

"اب..... جس کہانی کو سن کر میں تب جاتی ہوں وہ ہے سوئی مہینوال۔۔۔ مہینوال کو ذرا شرم نہ آئی کہ سوئی بچاری گھڑے پر دریا پار کر کے رات کو اس سے روز آ کر ملتی ہے..... اس کو تو خود آنا چاہئے تھا.... یہ تو مرد کا کام ہے کہ عورت کا، کہ جان جو کھوں میں ڈالے۔ وہ مزے سے دوسرے کنارے کھڑا رہتا تھا..... پھر آخر ایک دن تو اس بچاری کو ڈوبنا ہی تھا۔"

"ارے! پھر سوئی کو بچانے کے لئے وہ بھی تو دریا میں اتر اٹھا اور ڈوب گیا تھا۔" رائیل کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

"بس ڈوبنا ہے اور ڈوبنا ہی ہے..... ہم لوگ تو یہی فلسفہ جانتے ہیں۔ کیسی کیسی قربانیاں دیں اور ہمت دکھائی ہماری عورتوں نے۔"

"اس لئے تو شاہ سائیں نے عورت کو عاشق کے روپ میں دکھایا ہے اور اسے بہت خراج تحسین پیش کیا ہے..... ہاں مگر اس سے جوگ لیتے ہوئے نہیں دکھایا۔"

"صحیح کہا آپ نے رائیل!"

"آج مجھے تم میں وہی پرانی لڑنے جھگڑنے اور ہر بات پر اڑ جانے والی زارا نظر آ رہی ہے تم نے خود کو پہچانا ہی نہیں۔ میں نے لائے خان کے کیس میں تمہیں اس کے لئے بہادری سے لڑتے دیکھا تو مجھے تب ہی لگا کہ تم بہت نڈر ہو۔ مجھے میرے ادارے کے لئے تم جیسی بہادر ساتھی چاہیے۔ ہم مل کر عورتوں کے حساس مسائل پر ان



کے ساتھ کھڑے ہونگے۔ بے سہارا مجبور عورتوں کے کیس لڑیں گے۔ میرا ساتھ دو گی ناں!"

"ہم شاہد ندیم، علی حیدر، اور فواد کو بھی شامل کریں گے۔"

"اوہ..... فواد..... تمہیں نہیں پتا؟"

"کیا؟ زارا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔"

"پچھلے دنوں اس کی ڈیڈ ہاڈی تین دن کے بعد اس کے فلیٹ سے نکالی گئی۔" رائیل نے افسردگی سے کہا

"اوہ نو..... کیا ہوا اسے.....؟"

"بہت ٹیلنٹڈ شخص تھا۔ بہت آگے جاسکتا تھا مگر ہمارے آرٹسٹوں کی موت اکثر ایسی المناک ہوتی ہے۔"

"نہیں..... یہ نہیں ہو سکتا....." زارا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"بس تنہائی اور بیماری نے اسے ختم کر دیا۔ یہاں تک کہ دو دن تک کسی کو اس کی موت کا پتا ہی نہیں چلا کیونکہ

وہ کسی سے ملتا جلتا ہی نہیں تھا۔ جب وہ آفس نہیں پہنچا اور کوئی اطلاع بھی نہیں دی تو ایک آفس ورکر اسکے فلیٹ

پر گیا.... یوں تیسرے دن پتہ چلا..... وہ دونوں ہی فواد کی باتیں کرتے رہیں اور روتی رہیں۔

☆.....☆.....☆

"ویلم ہوم آپی!" جیسے ہی زارا نے اپنے گھر کے گیٹ کے اندر قدم رکھا تو سائرہ نے اسکو پھولوں کا گلہ دستہ

دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیکس مائی ڈیر!" زارا نے اسے لپٹا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ رائیل بھی تھی۔ دونوں

بچوں، اسلم اور سائرہ نے رائیل کو سلام کیا۔ تھوڑا آگے گئے تو تائی امی نے اسے بھینچ بھینچ کر پیار کیا۔

"اللہ میری بچی کو صحت اور بڑی عمر دے۔" وہ بولی۔

"بیٹا! کیسی ہوں تایاجی نے کہا۔"

"اچھا زارا میں چلتی ہوں بہت جلد پھر ملاقات ہوگی۔"

رائیل نے کہا سب کو خوش کر کے چلی گئی۔ لاؤنج میں پہنچی تو زارا دیکھ کر چوکی کے سامنے ٹیبل پر بہت بڑا

کیک رکھا تھا اور سات چھوٹا سا بورڈ تھا جس پر welcome home لکھا تھا۔ اسلم نے اسکی طرف



نامیٹ بڑھایا۔ زارا نے کیک کاٹا اور اپنے ہاتھ سے ایک ایک کو پلیٹ میں ڈال کر دیا۔

”آج مل کر ڈنر کریں گے۔ بہت اچھی ڈشز بنائی ہیں میں نے۔“ تائی جی نے کہا۔

مزید ارڈر کرنے کے بعد زارا اور پرآئی۔ تقریباً ایک ہفتے کے بعد آئی تھی گھر۔ ہر چیز صاف ستھری اور قرینے سے رکھی تھی جیسی چھوڑ کر گئی تھی۔ رائیل نے بہت پیار سے اسے اپنے گھر رکھا۔ وہ خود کو پہلے سے بہت بہتر اور فریش سمجھ رہی تھی۔

”بی بی! میں یہاں بیٹھی ہوں کوئی کام ہو تو بتائیں“ بوانے کہا جو اس کے ساتھ اور پرآئی تھی۔

”بوا میری کرسی اور چھوٹی ٹیبل ٹیرس میں رکھ دو مجھے یہاں بیٹھنا ہے۔“

”اچھا جی!“

وہ لاؤنج سے اسکی کرسی اور چھوٹی ٹیبل رکھ کر دے گئی ٹیرس میں۔ رائیل نے نہ جانے اس کے بارے میں سب کو کیا کہہ کر مطمئن کیا کہ کسی نے سوال نہیں کیا۔

”بوا تم سو جاؤ لاؤنج میں۔ مجھے کوئی کام نہیں۔ میں یہاں بیٹھی ہوں نیند آئے گی تو کمرے میں جا کر سو جاؤں گی۔“

”اچھا جی“ کہہ کر بوا لاؤنج میں چلی گئی اور لایٹ آف کر کے اپنی مخصوص جگہ پر سونے کے لئے لیٹ گئی۔ یہ سب میری فیملی تو ہے۔ تایا جی اور تائی جی.... اسلم اور سائرہ.... ان سب کو میری ضرورت ہے یہ مجھے ان کی شفقت اور بچوں کی محبت کی۔“

ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ سیل فون کی رنگ ٹون بجی۔ اس نے ہینڈ بیک سے فون نکال کر دیکھا تو کانپ سی گئی۔ علی حیدر کی کال تھی۔ اس نے اٹینڈ کی۔

”کیسی ہو زارا؟“ اسکی جیسے روتی ہوئی سی آواز آئی۔“

”ٹھیک ہوں۔“

وہ خاموش ہو گیا.... دونوں خاموش تھے..... پھر وہ بولا:

”زارا! مجھے معاف کر دو..... زارا! بس پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ میں بہت ڈر گیا تھا.....“..

خاموشی کا وقفہ..... پھر کلام

"شاہ سائیں کا ایک بیت ہے جس کا مفہوم ہے کہ

میرے محبوب، مجھ پر تیر چلا کر مت مارنا .... میرے اندر تو بستا ہے، کہیں تیرا تیر تجھے ہی نہ لگے....."

"زارا تم تو میرے اندر ہو..... مجھ میں رچی بسی ہو..... میں نے جو بھی دل دکھانے والے الفاظ کہے

وہ تمہارے لئے نہیں تھے..... میرے لیے تھے..... وہ سارے تیر مجھے ہی لگے....."

اس کی آواز لرز رہی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔

"زارا! تم نے یہ غور نہیں کیا کہ میں نے تو اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر سہل شادی کی اطلاع دی.....

بس....! زبیہ نے بتایا کہ تم نے اچانک اسے بلا کر دیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جس قسم کی پوشیں لگا رہی

تھی شاید تم برداشت نہ کر سکی۔ میں نے اس لیے تمہیں فوٹو نہیں بھیجے کہ تم زبیہ کے اکاؤنٹ کے ذریعے دیکھ

رہی تھیں۔"

"زارا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے....."

"زارا میں بھی تو ایڈ تھا تم دونوں کے پاس۔ کبھی تم نے میری طرف سے اس کے لیے کوئی جذباتی یا رومانی

جملہ لکھا دیکھا؟

پھر وہ بھی تو آخر ایک لڑکی ہے..... اس لیے وہ اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ باقی سارے منظر فوٹو گرافر

کے اصرار پر بنائے گئے تھے۔ سارے فرمائشی پوز تھے....."

زارا کچھ نہ بولی۔

"زارا میری امی اور بہنوں کو بہت ارمان تھا میری شادی کا..... ان کی خوشی کے لئے مسکراتا تھا۔ ہنستا

تھا..... پوز بنواتا تھا..... یہی میرا قصور تھا نا؟....."

"زارا! تھوڑا نا تم دیتی مجھے..... میں نے بہت غلط رویہ رکھا..... مجھے اس کا احساس ہے۔"

"زارا!..... زبیہ مجھے پا کر بہت خوش ہے اس میں اس کا کیا قصور؟..... شاید اس کی جگہ کوئی بھی

لڑکی ہوتی وہ مجھے پا کر اتنا ہی خوش ہوتی..... بس صرف تمہارے لئے کمتر تھا نا..... تمہاری ذات اونچی

ہے۔ باقی ..... مجھ میں کیا کمی تھی؟".....

اب زارا اسکیاں لے لے کر رونے لگی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

"میں تمہارے لئے شاید کچھ بھی نہیں۔ تم نے میری محبت کا جواب محبت سے کبھی نہیں دیا..... میں برسوں سے تمہارے منہ سے فقط love you سننے کے لیے ترستار ہا تھا..... کچھ مت کہو کچھ مت کہنا کبھی..... بس میرے لیے۔ یہی کافی ہے کہ میرے دل کی رانی تم ہو..... اور ہمیشہ رہوں گی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے سیل فون سے کال ختم کر دی۔ زارا اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

اپنے بیڈ پر بے سدھ ہو کر لیٹ گئی۔ آنسو بہتے رہے۔ مگر آج اس کا دل ہلکا تھا۔ جیسے سینے سے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آج وہ سب جا مشوروں میں دریا کے کنارے بنے ہوئے ہوٹل میں جمع ہوئے تھے۔ زارا، لائبریا خان، علی حیدر، شاہد ندیم اور رائیل۔ آج یہاں سب کو جمع کرنے کا سہارا رائیل کے سر تھا۔

"واہ بھئی! کیا دور یاد دلا دیا۔ یونیورسٹی کا زمانہ، آرٹ اینڈ لٹری سوسائٹی کا دور۔" شاہد ندیم نے کہا۔

اتنے میں دور سے حسین سید آنا دکھائی دیا تو زارا کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

رائیل نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبا کر جذبات قابو میں کرنے کا اشارہ کیا۔

"ہیلو ایوری بڈی! بہت خوشی ہوئی سب کو ساتھ دیکھ کر۔" حسین نے قریب آ کر کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ سب نے رکھی ہیلو ہائے کیا سوائے زارا کے۔

"آج ہم سب اکٹھے ہوئے ہیں۔ اپنی دوستی کو پھر سے تازہ کرنے ایک ساتھ کام کرنے کے لئے۔ مگر آج ہم اپنے ساتویں دوست فواد احمد کو بہت مس کر رہے ہیں۔ میں اسکے کام کو جمع کر کے اس کے نام سے اپنے ادارے کے اندر ہی ایک گیلری بنائوں گی۔" رائیل نے کہا۔

"میں نے کئی مرتبہ اس سے رابطہ کیا اپنے میگزین کے لئے اس کا انٹرویو کرنے کے لئے مگر وہ ٹال گیا۔ بہت تنہا کر دیا تھا اس نے خود کو۔" شاہد نے دکھ سے کہا۔

"آج جو ہم سب وہ دور یاد کرتے ہیں تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ شوڈنٹ لائف کا دور سب کو ہی اچھا لگتا ہے۔ بے فکری اور آنکھوں میں خواب سجانے کا دور۔ جیسے ہی ہم اس دور سے نکل کر اس سسٹم کا شکار ہوتے ہیں تو پھر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے ہیں۔" لائبر خان نے کہا۔

"یہ ٹوٹ پھوٹ ہی زندگی کا حصہ ہے۔" رائیل نے کہا۔

"میں نے سب کو اس لیے جمع کیا ہے میں چاہتی ہوں کہ ہم پہلے کی طرح مل کر کام کریں۔"

"میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" شاہد نے کہا۔

"میرے لئے یہ اعزاز ہوگا" علی حیدر نے کہا۔

"میرے لیے رائیل کے ساتھ کام کرنا باعث فخر ہوگا۔" لائبر خان نے کہا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔" زارا نے کہا۔

"میں گو کہ آپ لوگوں سے دور ہوں، دوسرے شہر میں ہوں مگر جو بھی خدمت میرے لائق ہوں میں اس کے لئے حاضر ہوں۔" حسین نے کہا۔

پھر وہ ایک دوسرے سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ حسین کو مستقل اپنی طرف تکتے دیکھ کر زارا کو کوفت ہونے لگی اور وہ وہاں سے اٹھ کر لان کر اس کرتی ہوئی دریا کے کنارے لگی ریٹنگ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

شام ڈھلنا شروع ہو رہی تھی۔ سندھو کے کنارے خوبصورت منظر تھا۔ آسمان پر اڑتے پرندے۔ دریا کا پانی .... ڈھلتا ہوا سورج ..... یہ جگہ تو ہمیشہ سے ان سب کی فحورٹ تھی۔

"زارا! حسین تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ ایک بار سن ضرور لو۔ ہاں فیصلہ صرف تمہارا اپنا ہونا چاہیے۔ صرف اپنے دل کی بات سننا نہ کسی دوست کا مشورہ نہ کسی کا دباؤ....." رائیل نے اس کے قریب آ کر کہا۔

زارا نے مڑ کر دیکھا کہ حسین اسی کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو رائیل جانے لگی۔

"کیسی ہو زارا؟"

"ٹھیک ہوں۔"

"بہت عرصے کے بعد تمہیں سامنے دیکھ رہا ہوں۔ بہت بدل گئی ہو۔"

"وہ کیسے۔"

"تمہارا وہ مخصوص میئر سائل نہیں ہے۔"

"آپ کا بھی تو نہیں ہے۔"

"ہاں..... یہ تو ہے۔"

پھر وہ خاموش ہو گیا۔ جیسے الفاظ کو ترتیب دے رہا ہو۔ جیسے کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔

"زارا! میں نے بہت پیسہ کما لیا ہے۔ مگر خوش نہیں ہوں۔ ٹوٹ گیا ہوں۔ بہت بکھر گیا ہوں۔ بہت اکیلا

ہوں۔"

زارا کا دل چاہا کہ کہے کہ دو بیویوں اور تین بچوں کے ساتھ بھی تنہائی کا شکار کسی اور کو کیا دے سکتا تھا۔ ہاں

اس نے خود کو بہت maintain رکھا ہوا تھا۔ عورتیں دلچسپی لے سکتی ہیں۔

"ہم ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ میں انورڈ کر سکتا ہوں اب بھی وقت ہے۔"

"حسین صاحب! اس سندھو دریا سے آگے جہاں ہماری مادر علمی ہے، کبھی پھر آپ گئے؟" اچانک زارا

نے عجیب سا سوال کیا تو وہ بولا:

"نہیں!"

"وہاں جا کر دیکھیں۔ بہت تبدیلی آچکی ہے وہاں۔ تعلیمی معیار سے لے کر ماحول تک....."

"اچھا!"

"سندھو کے پانی کو دیکھ رہے ہیں ناں؟"

"ہاں"

"جب ہماری سٹوڈنٹ لائف تھی تو یہ دریا لبالب ہوتا تھا اور اس کی موجیں اٹھکیلیاں کرتی تھیں۔ اب کتنا کم

پانی ہے۔ اس دریا کے آخری سرے، کوٹری کے پل تلے تو سارا سال دھول اڑتی رہتی ہے۔ جب ملک میں

سیلاب آتا ہے تو وہاں پانی آتا ہے۔"

"ان سب باتوں سے میرے پر پوزل کا کیا واسطہ؟" حسین الجھ کر بولا۔



”بہت گہرا واسطہ ہے حسین صاحب!“

”کیا مطلب؟“

”یہ سب تبدیلیاں بتاتی ہیں کہ وقت بہت گزر چکا ہے کیونکہ یہ کسی کے لئے نہیں ٹھہرتا..... گزر جاتا ہے....“

تو وقت ہے نہیں..... بلکہ وقت کب کا گزر چکا ہے..... خدا حافظ!“

یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی..... جہاں دور علی حیدر بھی ریٹنگ سے فیک لگائے کھڑا اسے لوٹ کر آتا ہوا دیکھ کر مسکرا رہا تھا جب وہ اس کے قریب پہنچی تو اس نے کہا:

”کچھ مت کہنا۔ مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔ میں تمہیں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

”تبھی تو لوٹ کر آگئی ہوں..... تمہاری طرف“ زار نے مسکرا کر کہا۔

دور بیٹھی رائیل کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس مرحلہ زار نے آخر اپنے دل کی بات سن لی تھی۔

✿..... ختم شد.....✿